اُردو شاعری اور مزاحمت: آزاد کشمیر کی شاعری میں مزاحمتی عناصر

مقالہ برائے ایم۔فل (اُردو)

مقالہ نگار:

خالد توفیق

نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

مارچ ۲۰۲۲ء

اُردو شاعری اور مزاحمت: آزاد کشمیر کی شاعری میں مزاحمتی عناصر

مقالہ نگار:

خالد توفیق

یہ مقالہ

ایم۔فل (اُردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگویجز

(اُردو زبان و ادب)

نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

مارچ ۲۰۲۲ء

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انھوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: اردو شاعری اور مزاحمت: آزاد کشمیر کی شاعری میں مزاحمتی عناصر کا مطالعہ

پیش کار: خالد توفیق رجسٹریشن نمبر:14/MPhil/Urd/S20

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: شعبہ اردو زبان و ادب

ڈاکٹر محمود الحسن رانا ____________________

نگران مقالہ

پروفیسر جمیل اصغر جامی ____________________

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

بریگیڈئیر سید نادر علی ____________________

ڈائریکٹر جنرل

تاریخ: ______________

اقرار نامہ

میں خالد توفیق حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا مواد میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد کے ایم فل اردو کی حیثیت سے ڈاکٹر محمود الحسن رانا کی زیر نگرانی مکمل کیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی یونی ورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گا۔

خالد توفیق

مقالہ نگار

نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

فہرست ابواب

ABSTRACT

Title: Urdu Poetry and Resistance: A Study of resisting factors in Azad Kashmir`s Poetry

Primarily, literature depicts resistance and retaliation and the history of Urdu literature is one of its most illustrious examples. People of literature have always raised their voice to effectively tackle the challenges posed by cruelty, oppression and injustice. One can see distinct presence of resistance in AJK literature, forcefully resisting cruelty and oppression whereas its poetry has its own unique share in vociferously highlighting political and social issues. Further more an attempt has been made to unveil state opressiol, degradation of social insititutes and tyranny through the use of literature.

The dissertation under consideration consists of four sections; the first section deals with the basic arguments where resistance in Urdu literature has been described through poetry. At the same time, a brief description of prominent poets who emerged on the literary horizon of AJK and their literary services has been given.

Similarly, the resistant streak found in AJK Urdu poetry has been highlighted in section two. Here an endeavour has been made to comprehend the resistance tendency of eminent poets by solely analysing their resistance poetry.

The third section deals with resistance in AJK Ghazals and their contribution to highlighting state oppression, societal discrimination and other social issues.

The last section is dedicated to developing an understanding of other literary tools such as Katats and anthem etc. with regard to resistance in literature. The final part of this section carries the conclusion of aforementioned arguments, their results along with proposed recommendations.

اظہارِ تشکر

خدائے لم یزل کا بے پناہ شکر ادا کرتا ہوں، جس نے مجھ جیسے کاہل پرست کو اس قابل بنایا کہ اس مقالے کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکا۔ دورانِ تحقیق بے شمار مشکلات در آتی رہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل و کرم کی بنا پر ان مصائب و مشکلات سے چھٹکارے کا کوئی نہ کوئی سبب بن ہی جاتا۔ میرے والدین جن میں والد محترم اقرار حسین اور والدہ محترمہ بشیر فاطمہ نے میری پرورش سے لے کر میری تعلیم کے حوالے سے جو کچھ کیا اس کا بدلہ چکانا ممکن نہیں ہے، میرے والدین جن کی بے پناہ دعائیں میرے ساتھ شامل رہیں، میری اس کام یابی میں والدین کی دعاؤں کی تاثیر ہے مزید براں تحقیق کی اس پُر خار وادی میں قدم رکھنے کے قابل بنانے میں میرے اساتذہ کی محنت، شفقت، پیار، راہ نمائی کے علاوہ ان کا مجھ پہ وسیع تر اعتماد کا بہت بڑا حصہ ہے۔

میں اپنے پرائمری کے اساتذہ سے لے کر لمحہ موجود تک جملہ اساتذہ کرام کا شکر گزار ہوں، جنھوں نے بہت محبت اور محنت سے مجھے اس مقام تک پہنچایا۔ خصوصاً اپنے نگرانِ مقالہ ڈاکٹر محمود الحسن رانا کا ممنون و متشکر ہوں جنھوں نے دورانِ تحقیق نہ صرف میرے حوصلے کو تقویت بخشی بل کہ تحقیق کے حوالے سے معاونت بھی کی۔ ان کی اس اعانت کے بغیر یہ کام تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس کے علاوہ میری پسندیدہ درس گاہ "نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد" کے جملہ اساتذہ میرے شکریے کے مستحق ہیں، جن میں ڈاکٹر نعیم مظہر، ڈاکٹر صائمہ نذیر، ڈاکٹر بشریٰ پروین، ڈاکٹر رخشندہ مراد، ڈاکٹر نازیہ یونس، ڈاکٹر ارشاد بیگم اور ڈاکٹر صنوبر الطاف کا بھی شکر گزار ہوں، جنھوں نے ایم فل کے کورس ورک کے دوران میں تحقیق کے فن سے آشنا کیا۔ مزید براں نمل کے دیگر مہربان اساتذہ ڈاکٹر فوزیہ اسلم صدر شعبہ اُردو، ڈاکٹر عابد حسین سیال (سابق صدر شعبہ اردو)، اور ڈاکٹر شفیق انجم کی شفقت کا بھی ممنون ہوں۔

میں استاذِ محترم فرہاد احمد فگارؔ کا بھی دل سے سپاس گزار ہوں، جن کی مشفقانہ اور استادانہ راہ نمائی نے ہی مجھ میں اعلیٰ تعلیم کے حصول اور تحقیقی کام کرنے کے لیے شوق و جستجو پیدا کی۔ بکھرے ہوئے ادبی خزانوں سے اپنے کام کے موتی چننے کا سلیقہ اور ڈھنگ بھی مجھے ان کی حوصلہ افزائی سے ملا۔ جس کے لیے میں اظہارِ تشکر کے مناسب الفاظ دریافت نہیں کر پا رہا۔ اللہ تعالیٰ سے محترم فرہاد احمد فگارؔ سمیت سبھی اپنے اساتذہ کرام کی صحت و سلامتی اور دینوی و اخروی عزت و سربلندی کی دعا کرتا ہوں۔

اس تحقیقی کام میں میرے حوصلے کو تقویت بخشنے پر میں Concepts کالج، راول پنڈی کے علمی و ہم پیشہ رفقائے کار (لیکچررز) جن میں محمد طاہر زمان، اظہر الاسلام، غضنفر علی رانا، محمد ساجد فاروقی، ڈاکٹر قمر اقبال، عبد البصیر اور محمد عمران حیدر کے علاوہ Scienta Vision کالج، اسلام آباد کے علمی رفیقوں میں سید احمد یحیٰ نقوی، عمر فاروق، تیمور ملک، محسن رضا، ثاقب نذیر، احتشام حسین، محمد حسنین سمیت محمد آصف چودھری، محمد شاہ پال اور طارق محمود کا بھی ممنون ہوں۔ مزید براں آزاد کشمیر یونی ورسٹی کے علمی رفقائے کار پروفیسر راجا رحمت علی خان کا بھی متشکر ہوں جن کی ہر ملاقات میں دوسرا یا تیسرا جملہ میرے تحقیقی کام کی بابت، ان کی زبان سے بے ساختہ سرزد ہوتا تھا۔ محبت بھرے یہ استفسارات میرے حوصلے کو مزید وسعت بخشتے رہے۔ آزاد جموں کشمیر یونی ورسٹی، مظفر آباد کے دیگر ساتھی اساتذہ کا بھی شکریہ ادا کرنا مجھ پہ واجب ہے۔

میں اپنے ماموں محترم سرفراز حسین کا بہ طور خاص شکریہ ادا کرنا بھی اپنا فرض سمجھتا ہوں، جن کے ساتھ ایم فل کے دوران میں بغیر کسی پریشانی کے شب و روز گزارے۔ ماموں نے اپنی ہم راہی میں ہم نوالہ و ہم پیالہ ہونے کا موقع دیا۔ اس لیے تحقیقی کام کی تکمیل پر ان کے تذکرے سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔

میرے ایم فل کے احباب میں سعید شارق، وسیم انور ممتاز، سلیم سرور، ایم۔اے (اردو) کے دوستوں میں سہیل میر اور شہزاد گل اعوان بھی بہ طور خاص شکریے کے مستحق ہیں۔ جنھوں نے میرے اس تحقیقی کام میں کسی بھی موقعے پر مایوس نہیں ہونے دیا۔ مزید براں میرے دوست فاضل نقوی، محمد وقاص (ہم جماعت گریجویشن) اور عنایت حسین مغل کی محبتیں بھی میرے ساتھ رہیں۔

تحقیقی کام کے سلسلے میں گاہے بگاہے میری اعانت کرنے اور ہماری یونی ورسٹی کی طرف سے جاری ہونے والے ہمارے متعلقہ نت نئے فرامین و حکم ناموں سے آگاہ کرنے پر ایم فل کی ہم جماعت ثناء عباسی اور طیبہ بتول کا بھی ممنون ہوں۔ باقی احباب اور عزیزوں کی فہرست کافی طویل ہے، اس لیے جن کے نام درج کرنے سے رہ گئے ہیں، ان سب کا بھی شکر گزار ہوں۔ علاوہ ازیں میں اپنے تمام متعلقین، بہن بھائیوں اور دیگر سبھی کرم فرماؤں کا سپاس گزار ہوں۔

خالد توفیق

ایم۔ فل (اُردو) اسکالر

باب اول:

موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف: تمہید

ا۔ موضوع کا تعارف(Introduction to Research Work)

مجوزہ تحقیقی کام ''آزاد کشمیر کی اردو شاعری میں مزاحمتی عناصر '' پر مبنی ہے۔ مزاحمتی ادب کے ضمن میں ہماری اردو ادب کی تاریخ ثروت مند ہے۔ کوئی بھی زمانہ ایسا نہیں گزرا جب اہل قلم نے ارباب اختیار کے ظلم و ستم، جبر و تشدد، وحشت و بربریت، لوٹ کھسوٹ اور سازشوں کے پردے چاک نہ کیے ہوں۔ مزاحمتی ادب کی اصطلاح پہلی بار فلسطینی مصنف غسان کانافیانی نے ۱۹۶۱ء میں اپنی کتاب ''مقبوضہ فلسطین میں مزاحمتی ادب''میں استعمال کی۔

گویا مزاحمتی ادب کی اصطلاح عہد آمریت میں وجود میں آئی۔اس طرح ایک جانب ویت نام، فلسطین، الجزائر اور کشمیر کی آزادی کے لیے لکھا جانے والا ادب مزاحمتی ادب کہلایا تو دوسری جانب سماجی ظلم و جبر اور مقتدر طبقات کی طرف سے ہونے والے ظلم و جبر کے اندھیروں کے خلاف جنم لینے والا ادب بھی مزاحمتی ادب کہلاتا ہے۔ اردو میں مزاحمتی ادب کی بحث زیادہ پرانی نہیں ہے۔ ترقی پسند تحریک کے قیام کے بعد اردو ادب میں انقلابی فکر کی روشنی میں مزاحمتی عناصر کی پرداخت کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

پاکستان کی طرح آزاد کشمیر کے شعری افق پر تخلیق ہونے والے ادب میں بھی انقلابی فکر اور مزاحمت کے مضامین پوری شد و مد کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ اس خطے میں مزاحمتی شاعری کے پنپنے اور اس کے مقبول ہونے کی ایک سے زائد وجوہات ہیں۔ اس کی اولین وجہ تو خود کشمیریوں کی ساری تاریخ مزاحمت اور جہدِ بقا کی تاریخ ہے۔ علاوہ ازیں کشمیر کے سیاسی مستقبل کے سوال پر الحاق و خود مختاری کی بحث، مطلق العنان انتظامیہ کا ریاستی جبر اور سماجی ظلم بھی مزاحمتی فکر کی وجوہات ہیں۔

ان وجوہات کی بنا پر آزاد کشمیر میں تخلیق ہونے والی مزاحمتی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے بہ طور خاص دیکھا گیا ہے کہ آزاد کشمیر کی شاعری میں مزاحمت کس نوعیت کی پائی جاتی ہے۔

۲۔ بیان مسئلہ (Problem Statement)

آزاد کشمیر کی اردو شاعری متنوع مضامین اور فکر کی حامل ہے۔ یہاں کی شاعری میں مزاحمتی حوالے سے تاحال کوئی مبسوط تحقیقی کام سامنے نہیں آیا۔ مجوزہ تحقیقی کام میں مزاحمتی شاعری کی مختصر روایت کو زیر بحث لاتے ہوئے آزاد کشمیر کی اردو شاعری میں مزاحمت کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

۳۔ مقاصد تحقیق (Research Objectives)

مجوزہ تحقیقی کام کے مقاصد بہ ذیل ہوں گے۔

۱۔ اردو میں مزاحمتی ادب کا مطالعہ کرنا۔

۲۔ آزاد کشمیر کی اردو نظم میں مزاحمت کا مطالعہ کرنا۔

۳۔ آزاد کشمیر کی اردو غزل میں مزاحمتی عناصر کا جائزہ لینا۔

۴۔ آزاد کشمیر کی دیگر اصناف شعر میں مزاحمت کا جائزہ لینا۔

۴۔ تحقیقی سوالات (Research Questions)

مجوزہ تحقیق کے دوران میں بہ ذیل سوالات پیش نظر رہے۔

i. اردو میں مزاحمتی ادب کی روایت کس نوعیت کی ہے؟

ii. آزاد کشمیر کی اردو نظم میں مزاحمت کے نمایاں عناصر کیا ہیں؟

iii. آزاد کشمیر کی اردو غزل میں مزاحمت کی نوعیت کیا ہے؟

iv. آزاد کشمیر کی دیگر اصنافِ شعر میں مزاحمت کی نوعیت کیا ہے؟

۵۔ نظری دائرہ کار (Theoretical Framework)

مجوزہ تحقیقی کام اردو شاعری اور مزاحمت سے متعلق ہے کہ ایک ادیب کس طرح جبری قوتوں کے خلاف اپنا قلم اٹھاتا ہے اور اس کی نوعیت کیا ہوتی ہے۔ ادب انسانی زندگی کو براہ راست متاثر کرتا ہے اور یہ معاشرے کو شعور کی آگاہی فراہم کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ ایسا کوئی ادیب یا شاعر نہیں جس کے دل و دماغ کو ظلم وجبر نے جھنجوڑا نہ ہو۔ جس کے قلم سے روشنائی کے بدلے خون نہ ٹپکا ہو۔

ڈاکٹر رشید امجد کی مرتب کردہ کتاب ''مزاحمتی ادب اردو'' میں مزاحمتی ادب کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ دوران تحقیق اس کتاب سے اخذ شدہ نتائج کو مد نظر رکھا گیا ہے۔ جس میں انھوں نے جبر کے ایک عہد

کے خلاف تحریری و تخلیقی جدوجہد کو منظر عام تک لانے کی سعی کی گئی ہے۔ مزید براں اس کتاب میں مزاحمتی ادب کے بنیادی نکات کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے یہ کتاب مجوزہ موضوع پر تحقیق کے لیے خاص اہمیت رکھتی ہے۔

ڈاکٹر رشید امجد کی مرتب کردہ کتاب ''مزاحمتی ادب اردو'' میں مزاحمتی ادب کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ دوران تحقیق اس کتاب سے اخذ شدہ نتائج کو مد نظر رکھا گیا ہے۔ جس میں انھوں نے جبر کے ایک عہد کے خلاف تحریری و تخلیقی جدوجہد کو منظر عام تک لانے کی سعی کی گئی ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد کے مطابق: پاکستانی ادیبوں نے اپنے عہد کی بے انصافی، طبقاتی کش مکش، مارشلائی ادوار میں سیاسی جبریت، عدم معاشی مساوات، اخلاقی انحطاط، سماجی جبر و تشدد، آزادی اظہار رائے پر قدغن اور استحصال جیسے عناصر کے خلاف بھرپور رد عمل اور مزاحمت کی ہے۔ ''آزاد کشمیر میں اردو شاعری'' از ڈاکٹر افتخار مغل میں مزاحمتی ادب کی مباحث ملتی ہیں، اس لیے زیر نظر تحقیق میں تجزیہ اور نتیجہ کاری کے لیے نظری سطح پر ان محققین کی آرا اور مذکورہ بالا مزاحمتی عناصر کو بنیاد بنایا گیا ہے۔

۶۔ تحقیقی طریق کار (Research Methodology)

اس تحقیقی موضوع پر تحقیق کے لیے مواد کی جمع آوری، ترتیب اور تجزیے کے لیے دستاویزی طریقہ کار اپناتے ہوئے بنیادی ماخذات کے ساتھ ساتھ تاریخی اور تنقیدی کتب سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ بنیادی ماخذات میں آزاد کشمیر کے زیادہ مزاحمتی رجحان کے حامل شعرا کی کتابیں اور کلیات جب کہ ثانوی ماخذات میں ان کے فکر و فن سے متعلق طبع ہونے والے مضامین، کتب اور رسائل شامل ہیں۔ جن تک رسائی کے لیے سرکاری (نیشنل خورشید لائبریری مظفر آباد، اور میاں محمد بخش لائبریری، میرپور، آزاد کشمیر، کتب خانہ اکادمی ادبیات آف پاکستان، اسلام آباد) اور نجی (کتب خانہ فرہاد احمد فگار، لوئر چھتر مظفر آباد، دائم اقبال پبلک لائبریری، اسلام گڑھ، ضلع میرپور) و جامعاتی (نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، علامہ اقبال یونی ورسٹی اسلام آباد اور آزاد جموں و کشمیر یونی ورسٹی، مظفر آباد) کتب خانوں سے بھی استفادہ کیا گیا۔ انٹرنیٹ بھی دور حاضر میں ایک معاون و مددگار ثابت ہوتا ہے، لہٰذا اس تحقیقی کام کی تیاری میں انٹرنیٹ سے استفادہ کرنے کے علاوہ اخبارات بھی پیش نظر رہے۔

۷۔ مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق (Work Already Done)

مجوزہ موضوع پر جامعاتی سطح پر نہ ہونے کے برابر تحقیق کی گئی ہے تاہم اس موضوع پر قریب قریب جو تحقیقی کام ابھی سامنے آیا ہے اس کی تفصیل بہ ذیل ہے:

۱۔ آصف اسحاق، آزاد کشمیر کے منتخب شعرا کی نظم کا فنی جائزہ، مقالہ برائے ایم فل (اردو)، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۱۹ء۔

۲۔ خالد توفیق، اکرم سہیل بہ حیثیت شاعر، مقالہ برائے ایم اے (اردو)، آزاد کشمیر یونی ورسٹی، مظفر آباد، ۲۰۱۸ء۔

۳۔ فرہاد احمد، آزاد کشمیر کے منتخب غزل گو شعرا، مقالہ برائے ایم فل اُردو نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء۔

۴۔ عابد محمود عابد، محمد اکرم طاہر شخصیت و فن، مقالہ برائے ایم فل (اُردو)، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۱۹ء۔

۵۔ محمد عالم چودھری، آزاد کشمیر میں اردو زبان و ادب کا فروغ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی اردو، جامعہ کراچی، کراچی، ۲۰۰۱ء۔

۸۔ تحدید (Delimitation)

مجوزہ تحقیق ''آزاد کشمیر کی اردو شاعری میں مزاحمتی عناصر'' پر مشتمل ہے۔ جس میں صرف آزاد کشمیر سے تعلق رکھنے والے منتخب شعرا کی ستر کی دہائی کے بعد کی مطبوعہ شاعری میں مزاحمتی عناصر کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔ زیر نظر تحقیق کا دائرہ کار آزاد کشمیر کے مزاحمتی رجحان کے حامل شعری ادب پر مشتمل ہے ۔ آزاد کشمیر کے شعرا کی غیر مطبوعہ شاعری کے ساتھ ساتھ اردو زبان کے علاوہ دیگر زبانوں میں کی جانے والی شاعری بھی مجوزہ موضوع تحقیق سے مطابقت نہیں رکھتی، گویا مؤخر الذکر نوعیت کی شاعری شامل تحقیق نہیں ۔ مجوزہ تحقیقی کام میں آزاد کشمیر کا نثری ادب شامل نہیں ہے۔ علاوہ ازیں گلگت بلتستان اور مقبوضہ کشمیر کا شعری ادب بھی اس تحقیق کے دائرہ کار سے باہر ہے۔ مزید براں پاکستان و دیگر علاقوں کے شعرا کا کشمیر یا تحریک آزادی کشمیر یا کشمیر کی بابت لکھا گیا شعری ادب بھی اس تحقیق کا حصہ نہیں رہا۔ مقیم پاکستان (کشمیری مہاجر) کشمیری شعرا کا کلام بھی مجوزہ تحقیق سے باہر تصور ہوتا ہے۔

۹۔ پس منظری مطالعہ (Literature Review)

مزاحمتی ادب کی اصطلاح پہلی بار فلسطینی مصنف غسان کانافیانی نے ۱۹۶۱ء میں اپنی کتاب ''مقبوضہ فلسطین میں مزاحمتی ادب'' میں استعمال کی۔ مجوزہ تحقیق کے لیے پس منظری مطالعہ میں بہ ذیل کتب کا مطالعہ کیا گیا ہے۔

۱۔''مزاحمتی ادب اردو'' یہ کتاب ڈاکٹر رشید امجد کی مرتب کردہ ہے،اس کی دو جلدیں ہیں۔ جس میں مزاحمت کی بنیادی مباحث اور مزاحمتی ادب کی روایت کو بیان کرتے ہوئے پاکستان کے مزاحمتی ادب کو یک جا کیا گیا ہے۔ اس میں مزاحمتی ادبا و شعرا کی تحریروں (نظم و نثر) کو جگہ دی گئی ہے۔ یہ ایک مزاحمتی ادب کا انتخاب ہے۔

۲۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی کتاب ''تنقیدی اصطلاحات'' میں مزاحمت کی اصطلاح کے آغاز و ارتقا کا ذکر کرتے ہوئے مزاحمتی ادب کی تعریف و تشریح کو بیان کیا گیا ہے۔

۳۔ ڈاکٹر افتخار مغل کی کتاب ''آزاد کشمیر میں اردو شاعری'' بھی زیر نظر تحقیق کے لیے اہم کتاب ہے۔اس میں آزاد کشمیر کی اردو شاعری کے موضوعات، فکری رجحانات اور فنی رجحانات کا تذکرہ کرتے ہوئے اہم شعرا کے اسالیب اور ان پر ادبی تحریکات کے اثرات پر بھی سیر حاصل گفت گو کی گئی ہے۔

۴۔ پروفیسر مسرت صبوحی کی تصنیف ''کشمیر میں مزاحمتی ادب'' میں ۱۹۹۴ء تک کے کشمیر کے مزاحمتی ادب کو یک جا کیا گیا ہے۔اس میں کشمیر کے مزاحمتی شعرا کا تعارف اور فنی تجزیے کو پیش کیا گیا ہے مزید براں اس میں مزاحمتی نثر کا مختصراً تعارف کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ مقبوضہ کشمیر کے مزاحمتی ادب پر بھی طائرانہ نگاہ ڈالی گئی ہے۔

۵۔ اردو لغت بورڈ کراچی کے مرتب کردہ ''اردو لغت'' (تاریخی اصول پر) میں مزاحمت کے لغوی معانی و مفہوم کے ساتھ ساتھ مزاحمتی ادب کے لغوی مطالب بھی بیان کیے گئے ہیں۔

۶۔ فتح محمد ملک کی مرتبہ کتاب ''تحریک آزادی کشمیر اردو ادب کے آئینے میں'' مجوزہ موضوع کے لیے اہم کتاب ہے۔ جسے سنگ میل پبلی کیشنز نے ۲۰۰۱ء میں لاہور سے شائع کیا۔اس میں آزادی کشمیر کے حوالے سے مزاحمتی ادب پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

۱۰۔ تحقیق کی اہمیت (Research Gap)

ہر عہد میں اہلِ قلم ظلم و ستم اور سماجی برائیوں کے خلاف بر سر پیکار رہے ہیں۔ آزاد کشمیر کی شعرا بھی اس حوالے سے اپنا کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے آزاد کشمیر کی اردو شاعری میں ہر قسم کے جبر واستبداد کے خلاف آواز بلند کی گئی ہے۔ مثلاً ریاستی جبر، سماجی و عائلی فسطائیت، مطلق العنان حکومتی انتظامیہ کا جبر وغیرہ کو قلم کی نوک کے ذریعے سے بے نقاب کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

آزاد کشمیر کی مزاحمتی شاعری کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں ظلم کے خلاف احتجاج اور بین السطور مزاحمتی لہجے کی تیز دھار پائی جاتی ہے۔ اس اعتبار سے آزاد کشمیر کی مزاحمتی شاعری کا مطالعہ بہت ضروری ہو جاتا ہے تاکہ اس کو ادبی دنیا کے سامنے لایا جاسکے۔ اس حوالے سے مجوزہ تحقیقی کام منفرد اہمیت کا حامل ہے۔

ب۔ مزاحمت اور مزاحمتی ادب کا مفہوم

ادب بذاتِ خود ایک مزاحمتی عمل کا نتیجہ ہے۔ ادیب یا قلم کار جس معاشرے میں قیام پذیر ہوتا ہے تو وہ اپنے گردوپیش میں وقوع پذیر ہونے والے ہر طرح کے جبر واستبداد، مظالم اور مختلف سطح پر کیے جانے والے استحصال کے خلاف اپنے قلم کے توسط سے آواز بلند کرتا ہے۔ اردو ادب میں مزاحمت یا مزاحمتی ادب ایک خاص اصطلاح ہے۔ مزاحمت کے لیے انگریزی میں "Resistance" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی طرح عربی زبان میں اس کے لیے "مقاومت" کا لفظ مستعمل ہے۔ مزاحمتی ادب کی صراحت کرنے سے قبل مزاحمت کے لفظی مفاہیم کا ذکر کرنا لازم ہے تاکہ مزاحمتی ادب کی توضیح و تشریح کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

اردو کے مؤقر لغات میں مزاحمت کے قریباً ملتے جلتے معانی و مفاہیم درج ہیں، جیسے علمی اردو لغت میں مزاحمت کے معنی "ممانعت، تَعَرُّض"[۱] رقم ہے۔ جب کہ مصباح اللغات کے مؤلف کے نزدیک: "ساتھ کھڑا ہونا، مخالفت کرنا، قائم مقام ہونا"[۲] اسی طرح مزاحمت کے لفظی معنی کے حوالے سے اردو لغت (تاریخی اصول پر) میں یوں مرقوم ہے کہ: "روکنے کا عمل، روک ٹوک، رکاوٹ، ممانعت، تعرض، کسی پر تنگی کرنا"[۳] مزید براں فرہنگ آصفیہ میں بھی مزاحمت کے معنی "روک، تعرض، روک ٹوک، اٹکاؤ، ممانعت"[۴] درج ہیں۔

اس کے علاوہ مختلف علوم و فنون اور مضامین کی روشنی میں ''مزاحمت'' کا لفظ مختلف المعانی اصطلاح کے طور پر سامنے آتا ہے۔ مثال کے طور پر علم طبعیات میں ''مزاحمت'' بجلی کی ایک اصطلاح ہے، جس کا مطلب مادے کی وہ خاصیت ہے جو بجلی کے بہاؤ کو کنٹرول کرتی ہے۔ اسی طرح کامرس میں Market Resistance کی اصطلاح مروج ہے۔ جس سے مراد کسی نئی شے (Product) کو مارکیٹ میں درپیش مزاحمت ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں دوسری جنگ عظیم کے دوران میں مخصوص سیاسی صورتِ حال کے پس منظر میں ''مزاحمتی جنگ'' کی اصطلاح استعمال کی گئی۔ جب جرمن فوجوں نے یورپ کے بہت سے علاقوں پر جبری طور قبضہ کر لیا تو اس کے ردِ عمل میں روس، برطانیہ اور دیگر جرمنی مخالف ممالک نے، اپنی مخصوص جغرافیائی اور اندرونی سیاسی صورت حال کو پیش نظر رکھتے ہوئے، مختلف مزاحمتی، باغیانہ، احتجاجی اور انقلابی اقدامات اٹھائے۔

مزید براں علمِ اخلاقیات میں ''مزاحمت'' کی اصطلاح مخالفت کرنا، متفق ہونے یا حکم ماننے سے انکار کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ جب کہ علمِ قانون میں ''مزاحمت'' کے حوالے سے ایک خاص اصطلاح ''مزاحمت بے جا'' مستعمل ہے۔ اسی طرح اصطلاحاتِ زراعت میں مزاحمت کے کئی مفاہیم اور معانی پائے جاتے ہیں۔ عموماً زراعت میں مزاحمت سے مراد مدافعت، قوتِ مقابلہ اور روک وغیرہ ہوتا ہے۔ دیگر اصطلاحاتِ زراعت میں مزاحمتی ڈبا اور مزاحمتی رگڑ وغیرہ رائج ہیں۔ نفسیات میں مزاحمت کے کئی معنی ہیں، مثلاً اپنے معالج (ڈاکٹر) کے زیر علاج کسی مریض کے علاج معالجے میں رکاوٹ پیدا کرنا، کسی فرد کا کسی لاشعوری بات کو شعور میں آنے سے روکنا وغیرہ۔ علاوہ ازیں ''مزاحمت'' طبی اصطلاح کے طور پر بھی مخصوص معانی رکھتی ہے کہ جب گردشِ خون کے دوران میں Vascular bed میں مخالفت کا سامنا ہوتا ہے تو اسے Vascular Resistance سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ علمِ حیاتیات کی اصطلاح Resistance Trainaing مسل کی نشوونما میں ورزش کے اہم کردار کے بارے میں استعمال کی جاتی ہے۔

ادب میں بھی ''مزاحمت'' کی اصطلاح خاص حیثیت رکھتی ہے۔ ادب میں مزاحمت کو وہی مقام حاصل ہے جو جسم میں قوتِ مدافعت کو، بالفاظ دیگر ادب کے ارتقا کو مزاحمت کے ارتقا سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ ادب میں مزاحمتی رویہ، مزاحمتی ادب، مزاحمتی شاعری، مزاحمتی سوچ اور مزاحمتی قلم وغیرہ جیسی اصطلاحات مروج ہیں۔ آسان الفاظ میں جس ادب یا شاعری میں مزاحمت کی گھن گرج پائی جائے تو وہ

"مزاحمتی ادب یا مزاحمتی شاعری" کہلاتی ہے۔ اگرچہ مزاحمتی ادب اور مزاحمتی رویہ جدید اصطلاحات ہیں لیکن یہ بات واضح ہے کہ مزاحمتی ادب کی اصطلاح کی ولادت سے قبل کسی نہ کسی شکل میں مزاحمتی ادب موجود رہا ہے۔ اس نوعیت کا ادب کسی صنفِ سخن یا مخصوص دبستانِ فکر سے منسلک شعرا و ادبا کا رہین منت نہیں رہا ہے۔ مزید براں یہ کسی خاص علاقے، نسل، قوم یا ملک سے بھی مخصوص نہیں رہا۔

اصطلاحی معنوں میں "مزاحمتی ادب" کی بیسیوں تعریفیں ملتی ہیں اور ان سے اِس نوعِ ادب کے مختلف رنگ، پہلو، زاویے، جہتیں اور مفاہیم ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں مزاحمتی ادب کی اصطلاح کو کئی صاحبانِ علم و ادب نے مختلف انداز میں بیان کیا ہے۔ مزاحمتی ادب کی جامع، مبسوط، متفق علیہ قابل قبول تعریف کرنا آسان امر نہیں ہے، کیوں کہ سب نقاد اور ادیب مزاحمت کی کسی ایک تعریف پر متفق نہیں ہیں۔ ہمیں ان صاحبان علم کے مختلف اور متضاد نظریات کی روشنی میں عمومیت سے اختصاصیت کی جانب جانے کا راستہ ملتا ہے۔ مثلاً ڈاکٹر خواجا محمد زکریا مزاحمت کی اصطلاح کی بابت ان الفاظ میں صراحت کرتے ہیں کہ:

> "اگر مزاحمتی ادب سے مراد وہ ادب ہے جو معاشرے کو جبر، ناانصافی، ظلم اور تشدد وغیرہ سے نجات دلانے کے لیے ظالم سے آمادہِ جنگ کرتا ہے تو ہر لکھنے والے کی کوئی نہ کوئی تحریر اس ضمن میں شمار کی جاسکتی ہے۔"[۵]

ڈاکٹر خواجا محمد زکریا نے "اگر" کا لفظ استعمال کر کے اپنے مؤقف کی مکمل طور پر تائید نہیں کی۔ لیکن اس حقیقت کو بلا تامل ماننا پڑے گا کہ مزاحمتی ادب کی اصطلاح کا عام طور پر یہی مفہوم نکلتا ہے۔ جس کی محولہ بالا اقتباس میں نشان دہی کی گئی ہے۔ ڈاکٹر انوار احمد کا مزاحمتی ادب کی اصطلاح سے متعلق بہ ذیل سطور میں تجزیہ ملاحظہ ہو:

> "مزاحمتی ادب کی اصطلاح کا اطلاق استعمار کی گرفت میں جکڑے یا استعماری اثرات میں اسیر معاشرے کے باشعور فن کار کی مصلحت سوزی، با آواز بلند حق کی گواہی اور آنے والے کل کو اجلا اور روشن بنانے کے خواب کا اعتبار پیدا کرنے کی تخلیقی کاوش پر ہوتا ہے۔۔۔ غلامی کی ہر صورت سیاسی، معاشی، فکری اور ثقافتی، انسانیت کی تذلیل

ہے، یہی وجہ ہے کہ ہر باشعور باضمیر تخلیق کار فطرتاً آزاد ہوتا ہے اور غلامی مسلط کرنے کی ہر صورت اور ہر کوشش کے خلاف مزاحمت کرتا ہے۔"[٦]

ایک مزاحمتی شاعر ہمیشہ حالت جنگ میں ہوتا ہے۔ یہ جنگ سب سے پہلے وہ اپنے اندر لڑتا ہے۔ یہ جنگ سماج کی ناہمواریوں، معاشرے کے جہل، تعصبات، غیر انسانی رویوں، منافرت، ہوس ناکیوں اور سماجی کجیوں کو دیکھ کر اِس کے وجود میں جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ وہ ان خرابیوں کو برداشت کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ اِس کا اظہار کبھی نعروں، کبھی استعاروں میں اپنے طور سے کرتا ہے۔ اس انکار کو اپنے فن کی بقا کے لیے ضروری سمجھتا ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر انوار احمد نے ایک اور جگہ پر مزاحمتی ادب کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

"شاعر اپنے سماج اور معاشرے کا جزو ہوتا ہے۔ معاشی ناہمواریوں، ظلم، جبر اور استحصال کے خلاف آواز بلند کرنا، پِسے ہوئے طبقات کو نہ صرف ان کے حقوق سے آگاہ کرنا، بل کہ حصولِ حقوق کے لیے انھیں آمادہ پیکار کرنا مزاحمتی ادب ہے۔ ادب پوری زندگی پر محیط ہے اور مزاحمتی ادب اس کا ایک رخ ہے۔"[٧]

محولہ بالا رائے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سماج میں جنم لینے والی ہر ناہمواری کے خلاف آواز بلند کرنا، ظلم و جبر کے خلاف ڈٹ کر مقابلہ کرنا، پسے ہوئے طبقات کے سامنے ان کے حقوق کی نشان دہی کرنا اور ان طبقات کو اپنے حقوق کے حصول کے لیے تیار کرنا بھی مزاحمتی ادب کے فریضے میں شامل ہے۔ دراصل ہر قسم کے جبر و استحصال کے خلاف درس، مزاحمت کا درجہ رکھتا ہے۔ پروفیسر مسرت صبوحیؔ مزاحمتی ادب سے متعلق بات کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"مزاحمتی ادب کی اصطلاح ایسی اصطلاح ہے، جسے نہ صرف ذرائع ابلاغ میں استعمال کیا گیا بل کہ اسے نجی محفلوں میں بھی بہت پذیرائی ملی۔۔۔ یہ لفظ اپنے اندر بہت جارحیت لیے ہوئے ہے۔ مزاحمت کا جو مفہوم ذہن میں پیدا ہوتا ہے، وہ ایک ایسا نظام، رسم یا چلن ہے جو دل کو نہ بھائے، اسے ملک یا معاشرے میں پھلنے پھولنے سے روکنے کو مزاحمت کہتے ہیں۔"[٨]

مسرت صبوحی کے خیال میں مزاحمت کا لفظ اپنے اندر جارحانہ رویہ لیے ہوئے ہے۔ چوں کہ ادب ہمیشہ سے معاشرے کا عکاس رہا ہے۔ ہر عہد کے ادب میں مزاحمتی رویے، اس دور میں پیدا ہونے والے تہذیبی، معاشی، سیاسی، سماجی مسائل کی وجہ سے نمو پذیر رہے ہیں۔ مزاحمتی ادب ہر اس سماج میں جنم لیتا ہے

جہاں سماج کو ظالم اور مظلوم میں منقسم کر رکھا ہوتا ہے۔ جہاں سامراجی قوتوں کا غلبہ ہوتا ہے، جہاں طبقاتی نظام کی جڑیں مستحکم ہوتی ہیں۔ اس صورت حال کے خلاف ادبا و شعرا اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اس سماج میں ہونے والے ناانصافیوں اور ظلم و بربریت کے خلاف قلم کار آواز بلند کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ڈاکٹر سبینہ اویس اعوان کے بہ موجب:

> "مزاحمت ہر ایسے عمل، سوچ، رویے، طریق کار کو کہا جاسکتا ہے جو کسی ناانصافی، ظلم، تشدد، بربریت، جبر کے خلاف کیا گیا ہو۔ مزاحمت سے مراد کسی چیز کو روکنا، کسی ظلم کی مخالفت کرنا، کسی ناانصافی کو برداشت کرنے سے انکار کرنا اور عملی اور متحرک انداز میں کسی ظلم کا سد باب کرنا۔"[9]

مزید براں نعیم بیگ جبر اور استحصال کا محرک سیاسی و عمرانی دباؤ کو قرار دیتا ہے، اس ضمن میں نعیم بیگ کی مزاحمت سے متعلق وضاحت ملاحظہ ہو:

> "مزاحمت درحقیقت ان آزاد سماجی و ثقافتی رویوں کے جبری استحصال سے انکار کا نام ہے جو سیاسی و عمرانی دباؤ کے تحت انسانی زندگی میں در آتا ہے۔ ایسے جبری برتاؤ اور دستور کو جب ایک ادیب یا شاعر اپنے الفاظ میں ایک جدوجہد کا نام دیتا ہے تو اسے ہم مزاحمتی ادب کی شرح میں قبولیت بخشتے ہیں۔"[10]

ایک باضمیر، حساس اور باشعور فرد کا سماج میں جبر واستحصالی قوتوں کے خلاف عَلَم بغاوت بلند کرنے کا نام مزاحمت ہے۔ اہلِ قلم کا ظالم و جابر حکم رانوں، مقتدر اور مطلق العنان طبقات، سماجی ناہمواریوں اور کجیوں کے خلاف قلم و کاغذ کے ذریعے آواز اٹھانا مزاحمتی عمل ہے۔ انسانی تاریخ میں یہ مزاحمتی عمل ہمیشہ سے جاری رہا ہے۔ مزاحمتی عمل کے جاری و ساری رہنے کی توجیہی ابرار احمد اپنے ایک مضمون میں بیان کرتے ہیں:

> "استحصال اور جبر کی بے شمار قوتیں ہیں۔ بین الاقوامی سطح پر مضبوط اقوام کم زور قوموں پر اپنا شکنجہ جمائے رہتی ہیں۔ ہر سماج میں بالا دست طبقے عوام کا استحصال کرتے چلے آرہے ہیں۔ ریاست کے نام پر، مذہب کے نام پر، معیشت کے نام پر اور ان استحصالی قوتوں کے ہاتھ جھٹک دینے کے لیے مزاحمتی عمل بھی جاری و ساری ہے۔"[11]

محولہ بالا اقتباس سے عیاں ہوتا ہے کہ مزاحمتی ادب ہمیشہ جاری وساری رہا ہے، ہنوز بھی جاری ہے۔ مزاحمتی ادب کی متذکرہ بالا مباحث، مفاہیم و مطالب کی روشنی میں راقم السطور کی رائے میں مزاحمت اور مزاحمتی ادب کی مختصر تعریف بہ ذیل ہے۔

"ایک حساس، باشعور اور باضمیر فرد کا سماج میں جبر واستحصال کرنے والے عناصر کے خلاف عَلم بغاوت بلند کرنے کا نام مزاحمت ہے۔ مزید براں مزاحمتی ادب سے مراد ایسا ادب ہے جو کسی بھی نوعیت کے ظلم واستبداد کے خلاف تخلیق کیا گیا ہو۔"[۲۶]

مختلف سیاسی و معاشی نظریات و افکار کی روشنی میں مزاحمتی ادب کی وضاحت ان الفاظ میں بھی کی جاسکتی ہے کہ ایسا ادب جو ظالم اور مظلوم، سرمایہ دار اور مزدور، جاگیر دار اور محنت کش طبقے کے درمیان پائی جانے والی کش مکش میں طاقت ور طبقات کی مزاحمت کرے، مزاحمتی ادب ہوتا ہے۔ اسی طرح آمریت، سامراجیت، استعماریت، فسطائیت، نوسامراجیت اور نو استعماریت کے خلاف تخلیق ہونے والا ادب بھی مزاحمتی ادب کہلاتا ہے۔ علاوہ ازیں غیر ملکی تسلط اور فاتح قوم کے ظلم و تشدد کے خلاف جنم لینے والا ادب مزاحمتی ادب میں شمار ہو گا۔ انسانی حقوق کی پامالی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا بھی مزاحمتی ادب کے گنجینے میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔ انسانی جذبات میں مزاحمت کی شدت میں فرق کو ظاہری صورت میں ڈھالنے کے لیے بالترتیب احتجاج، بغاوت اور انقلاب کے الفاظ مروج ہیں۔ لہٰذا احتجاجی، باغیانہ اور انقلابی ادب بھی مزاحمتی ادب کی اقسام میں شامل ہوتا ہے۔

مزید براں جبر واستحصال کی جتنی بھی صورتیں ہیں، خواہ انفرادی سطح پر جبر ہو یا طبقاتی سطح پر، ریاستی جبر ہو یا بین الاقوامی نوعیت کا جبر، متشددانہ نظریات کا جبر ہو یا مصلحت پسندانہ جبر، سب صورتوں میں انسانوں کے رنگ ونسل اور جغرافیائی عصبیتوں کا شکار بنائے ہوئے ہیں۔ اسی طرح استحصالی طبقے کا تعلق بھی کسی مذہب سے ہو سکتا ہے۔ استحصالی طاقت قومی سطح کی حامل ہو یا بین الاقوامی اعتبار سے بنی نوع انسان کو استحصال کا نشانہ بنائے۔ نیز جبر واستحصال کے سیاسی، معاشی، مذہبی، ثقافتی کسی بھی زاویہ اثر کی کوئی تخصیص نہیں۔ اس کے نتیجے میں جنم لینے والا منفی اقدار کے خلاف نمودار ہونے والا ادب مزاحمتی ادب کے دائرہ کار میں شامل ہے۔

مزاحمتی رویہ یا مزاحمتی ادب کے سلسلے میں ایک بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مزاحمت کی اساس کس پر استوار ہے؟ اس ضمن میں ڈاکٹر سلیم اختر کی رائے ملاحظہ ہو:

> ”مزاحمتی رویہ اور اس کے نتیجے میں جنم لینے والے مزاحمتی ادب کی تشکیل میں کئی عناصر نے کار فرمائی دکھائی ہے۔۔۔ کمنٹ مٹ ، مزاحمت اور انقلاب ۔۔۔ دیکھا جائے تو اس مثلث میں سب کچھ سما جاتا ہے۔ کمنٹ مٹ محرک ہے۔ اس محرک کے زیر اثر قلم کے عمل کا نام مزاحمت ہے جب کہ انقلاب مزاحمت کا نقطہ عروج ہے۔“[۱۳]

مزاحمتی رویے اور اس کے نتیجے میں تخلیق ہونے والے ادب کے ضمن میں یہ بنیادی حقیقت ملحوظ رہے کہ یہ کسی بھی ملک اور قوم کی مخصوص سیاسی، سماجی اور اخلاقی صورت حال کے ردِ عمل میں ہوتا ہے یعنی اسے فرمہ نہیں بنایا جاسکتا۔ آج دنیا بھر میں جہاں کہیں بھی مزاحمتی ادب جنم لے رہا ہے، وہ اس ملک اور قوم کی مخصوص اساسی صورت حال سے مشروط ہے۔

کسی بڑے تصادم کے ردِ عمل میں ادب طراز قلم شمشیر کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ ایسے قلم کو ہاتھوں کا تقدس، ذہن کی عظمت و رِفعت اور قلبِ انسانی کی وسعت سمجھا جاتا ہے۔ جہاں تک مزاحمتی ادب یا شاعری کا تعلق ہے تو یہ کسی تصادم کا نتیجہ ہوتا ہے بل کہ مزاحمت تو بذات خود ردعمل کا دوسرا نام ہے۔ مزاحمتی ادب ہر نظریے، ہر دبستانِ ادب کا حامل شخص پیدا کر سکتا ہے، ماسوائے ضمیر فروش اور قلم فروش فرد کے، مزاحمتی ادب تخلیق کرنے والے ہر فرد کے نزدیک زندگی سے زیادہ قیمتی چیز آزادی رائے اور آزادی اظہار ہوتی ہے۔ ان کا جبر و تعدی کے خلاف احتجاج اور مزاحمت کرنا فرض عین ہوتا ہے۔

ج۔ اُردو شاعری میں مزاحمت کی مختصر روایت

جبر و اختیار جیسی صفات ہمیشہ سے انسان کی فطرت کا حصہ رہی ہیں۔ اس بنا پر انسان اپنی منشا کے موافق زندگی بسر کرنے کی ممکن حد تک سعی و جستجو کرتا ہے۔ جہاں اسے رکاوٹ یا ممانعت کا سامنا کرنا پڑے تو یہ جبر و اختیار کا سہارا لیتا ہے۔ کہیں یہ انسان پابندیوں کی بنا پر مجبور ہو کر غلامانہ زندگی گزارنے میں عافیت سمجھتا ہے اور کہیں ان پابندیوں کے خلاف زبردست انداز میں آواز بلند کرتے ہوئے مزاحمت کرتا ہے۔

اگر تاریخ کے اوراق پر نظر ڈالی جائے تو شعوری طور مزاحمت کی کوششیں دکھائی دیتی ہیں۔ مزاحمت کے لیے کوئی اپنے زورِ بازو کا استعمال کرتا ہے تو کوئی زورِ فکر کے ذریعے سے، اسی طرح کوئی اپنے مزاحمتی رویے کی مدد سے استعماری اور استحصالی طاقتوں کے خلاف مزاحمت میں مصروف عمل نظر آتا ہے۔ مزاحمت کی یہ

روایت اردو ادب کی نثری اصناف کی نسبت شاعری کے قالب میں زیادہ توانا اور متاثر کن معلوم ہوتی ہے۔ چناں چہ اُردو شاعری میں مزاحمتی رویوں کی گھن گرج خوب دکھائی دیتی ہے، جس نے ماقبل تقسیم اور مابعد تقسیم اپنا بھرپور کردار ادا کیا۔ جہاں قیامِ پاکستان سے قبل غیر ملکی قبضے، استحصالی قوتوں اور استعماری رویوں کے خلاف شعرائے اردو نے اپنا فرض نبھایا اور عوامی سطح پر آزادی کے شعور کو جلا بخشنے کے ساتھ ساتھ مزاحمت کرنے کا راستہ بھی ہموار کر دیا، جو برطانوی سلطنت کے خاتمے پر منتج ہوا۔

اُردو ادب میں شاعری کے باقاعدہ ابتدائی نقوش دکنی عہد سے ملتے ہیں۔ اس ضمن میں شاعری کا باقاعدہ آغاز قطب شاہی عہد اور بعد میں عادل شاہی عہد سے ہوتا ہے۔ لیکن جہاں اِس دور کی زبان ثقیل، نامانوس، بوجھل اور اجنبی ہے وہیں اس دور کی شاعری میں مزاحمتی رویے نظر نہیں آتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دور کے اکثر شعرا یا تو خود بادشاہ تھے یا ان میں چند ایک کو درباری شاعر کی حیثیت حاصل تھی۔ ولیؔ دکنی کے ہاں بھی باقاعدہ کوئی مزاحمتی رجحان نہیں ملتا۔

مُزاحمت کی تاریخ بھی اتنی ہی قدیم جتنی جبر کی ہے۔ عموماً ادب مزاحمتی نوعیت کا ہی ہوتا ہے۔ ادیب ہمیشہ جبر و استبداد کے خلاف آواز بلند کرتا ہے۔ اس حوالے سے اردو شاعری کی تاریخ پر نگاہ ڈالی جائے تو شمالی ہند (دہلی) میں اُردو شاعری کے آغاز کے ساتھ ہی مزاحمتی رویوں کا احساس ہوتا ہے۔ اُردو شاعری میں سیاسی رنگ کی نمود کے باب میں جعفر زٹلیؔ کو اولیت حاصل ہے۔ گویا اردو میں مزاحمتی شاعری کا باقاعدہ آغاز جعفر زٹلیؔ سے ہوتا ہے۔ جعفر کی "زٹلیات" میں مزاحمتی توانائی شدت سے موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رشید امجد، جعفر زٹلیؔ کو اُردو کا پہلا باضابطہ "مزاحمتی شاعر" قرار دیتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:

> "جعفر زٹلیؔ پہلا مزاحمتی شاعر ہے، جس نے اُورنگ زیب کے نالائق بیٹوں کے خلاف نظمیں لکھیں۔ جعفر زٹلیؔ فرخ سیر تک تمام نالائق اور نااہل حکم رانوں کے خلاف کھل کر لکھتا رہا اور اپنے اِس شعر پر
>
> سکّہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر
> پادشاہ پشہ کش فرخ سیر
>
> فرخ سیر کے حکم پر پھانسی لگا۔"[۱۴]

جعفر زٹلیؔ اپنے عہد کی ایک جان دار اور توانا آواز ہونے کے ناتے اپنے فن کا پہلا فرد تھا۔ اس کے فن کا اعتراف سب نے کیا۔ اس بابت اختر شیرانی نے یوں لکھا ہے کہ:

"مشہور تو زٹلی ہے مگر اپنے زمانے کا عجیب و غریب انسان تھا اور کاٹنے والی زبان کا مالک تھا۔"[۱۵]

اُس عہد میں جب انتشار ہر سُو پھیلا ہوا تھا، روز افزوں حکم ران بدل رہے تھے۔ صدیوں پرانی تہذیب کی کشتی ہچکولے کھا رہی تھی اور اس کی بنیادیں ہل چکی تھیں۔ جعفر زٹلیؔ نے ہجو، طنز اور زٹل کے ذریعے زوال کا احساس دلانے کی سعی کی۔ اس موقعے پر اس نے کسی کو معاف نہیں کیا۔ فرخ سیر جب تخت نشین ہوا تو اُس کا خاص "سکہ" جاری ہوا اور اُس سکے پر بہ طور خاص یہ شعر رقم کیا گیا کہ:

سکہ زد فضل حق بر سیم و زر
پادشاہ بحر و بر فرخ سیر

جس پر جعفر زٹلیؔ نے فرخ سیر کی مزاحمت اور تضحیک میں سکے کے لیے یہ شعر کہا:

سکّہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر
پادشاہ تسمہ کش فرخ سیر

مذکورہ شعر میں کہیں "تسمہ" اور کہیں "پشہ" درج ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے "تسمہ"[۱۶] اور ڈاکٹر رشید امجد نے "پشہ"[۱۷] نقل کیا ہے۔ اسی طرح محولہ بالا شعر حقیقت اور سچائی پر مبنی شعر تھا چوں کہ اُس وقت سلطنت کا خزانہ خالی تھا، بد انتظامی اور فسادات زوروں پر تھے معاشی حالات کی ابتری اس پہ مستزاد تھی۔ ظاہر ہے ایسے موقعے پر "گندم و موٹھ و مٹر" پر سکہ جاری کرنا مناسب تھا۔ فرخ سیر کو جب اس شعر کا علم ہوا تو اُس نے جعفر زٹلیؔ کو اس مزاحمت کی پاداش میں موت کے گھاٹ اتار کر امر کر دیا۔ جعفر زٹلیؔ اردو کا پہلا باغی اور مزاحمتی شاعر تھا جس نے ظالم حکم ران کے سامنے اپنی جان تک قربان کر دی مگر کلمہ حق کہنے سے باز نہیں آیا۔

جعفر زٹلیؔ کی پھانسی سے مزاحمت کی یہ روایت نہ تو ختم ہوئی، نہ شعرائے اردو کا زور قلم کم زور ہوا بل کہ مزاحمتی رویوں میں مزید پختگی آتی گئی۔ ایہام گوئی کے قالب میں بھی کئی شعرا نے مزاحمتی شاعری کی

روایت کو جاری رکھنے میں اپنا کردار ادا کیا۔ چناں چہ محمد شاہی دور میں کئی ایہام گو شعرا نے اپنے عہد کے اخلاقی زوال، سیاسی انحطاط، معاشی ابتری اور فکری انتشار کی بھرپور عکاسی کی۔ اسی عہد میں شہر آشوب اور ہجو نگاری کا آغاز ہوا۔ اس دور میں شہر آشوب وہ صنف شعر بن کر ابھری جو استحصالی رویوں اور قوتوں کے خلاف خوب مزاحمت کی صلاحیت رکھتی تھی۔ اس کی ابتدا اٹھارویں صدی عیسوی کے آغاز میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد کے ابتر سیاسی حالات سے ہوتی ہے۔ اورنگ زیب کے بیٹوں اور جانشینوں کی بے ہمتی، کم عقلی، غیر دانش مندی اور بے حوصلگی نے نہ صرف سیاسی بل کہ معاشرتی و معاشی سطح پر کچھ ایسی صورت حال تشکیل دے دی کہ یہی شعرا جو بادشاہوں کے قصیدے پڑھنے اور محبوباؤں کے رُخسار و زلف کے ذکر میں محو رہتے تھے۔ انھوں نے حکم رانوں کی قصیدہ خوانی کو ترک کر کے انہی حکم رانوں پر تنقید کے نِشتر چلانا شروع کر دیے۔

اس حوالے سے جعفر زٹلیؔ نے عوام اور خواص دونوں کے رویوں کے خلاف فارسی اور اردو میں مزاحمت کی۔ وہ جہاں فرخ سیر کو طعن و تشنیع کا نشانہ بناتا ہے اور وہیں بہادر شاہ ظفرؔ کی ہجو بھی رقم کرتا ہے۔ نیز زٹلیؔ عوامی رویوں کے خلاف بھی قلم استعمال کرتا ہے۔ مثال کے طور پر اس کے ایک شعر آشوب کے چند اشعار اس کیفیت کی خوب صورت عکاسی کرتے ہیں:

گیا اخلاص عالم سے ، عجب یہ دور آیا ہے
ڈریں سب خلق ظالم سے ، عجب یہ دور آیا ہے
ہنر مندانِ ہرجائی ، پھریں در بدر رسوائی
رذل قوموں کی بن آئی ، عجب یہ دور آیا ہے
سپاہی حق نہیں پاویں ، نت اٹھ اٹھ چوکیاں جاویں
قرض بنیوں سے لے کھاویں ، عجب یہ دور آیا ہے[۱۸]

مزید براں اس ضمن میں شرف الدین مضمونؔ، محمد شاکر ناجیؔ، میر عبد الحیٔ تاباںؔ، سراج الدین علی خاں آرزوؔ، یقینؔ، اشرف علی فغاںؔ، شیخ ظہور الدین حاتمؔ، حسین علی عزتؔ، قیام الدین قائمؔ چاندپوری، مرزا مظہر جان جاناںؔ، مرزا رفیع سوداؔ اور میر تقی میرؔ جیسے شعرا نے مزاحمت کی اس روایت کو آگے بڑھایا۔ مثلاً رفیع سوداؔ کے شعر آشوب اپنے عہد کے مجموعی زوال کی داستان سناتے ہیں۔ سوداؔ نے حکم رانوں کی غیر تسلی بخش کارکردگی اور ان کے رویوں کو ہدف تنقید بنایا ہے۔

جو کوئی ملنے ان کو انھوں کے گھر آیا
ملے یہ اس سے گر اپنا دماغ خوش پایا
جو ذکر سلطنت اس میں وہ درمیاں آیا
انھوں نے پھیر کے اودھر سے منہ یہ فرمایا
خدا کے واسطے بھائی کچھ اور باتیں بول [۱۹]

میرؔ کی شاعری ان کے مزاحمتی جذبات کی بولتی ہوئی تصویر ہے۔ اسی طرح سوداؔ کا کلام بھی مزاحمتی خیالات سے عاری نہیں۔ کلیات سوداؔ ہو یا دواوین میرؔ، دونوں مزاحمتی اشعار کے حوالے سے ثروت مند ہیں۔ میرؔ و سوداؔ کے شہر آشوب اپنے عہد کے سیاسی ماحول کی کام یاب عکاسی کرتے ہیں۔

اس کے بعد کلیمؔ، سجادؔ، دردؔ، میر حسنؔ، قدرت اللہ قدرتؔ، جعفر علی حسرتؔ، میر سوزؔ، احسن اللہ بیانؔ، ہدایت اللہ ہدایتؔ، جرأتؔ، احسانؔ، انشاؔ، رندؔ، مصحفیؔ، نظیرؔ اکبر آبادی، رنگینؔ، ناسخؔ، آتشؔ، مومنؔ اور شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ وغیرہ جیسے شعرا کے ہاں ہمیں مزاحمتی رویوں کا پتا چلتا ہے۔ جنھوں نے اپنے دور کے حکم رانوں، امرا کی کارکردگی، ان کے رویوں اور ان کی عدیم العقلی پر مزاحمت کی۔

اردو شہر آشوب میں اخلاقی انحطاط، معاشی بدحالی اور معاشرتی رویوں کا ذکر گو کہ زیادہ ہے اور سیاسی صورت حال کے خلاف مزاحمت کم دکھائی دیتی ہے۔ مگر معاشی بدحالی، اخلاقی انحطاط اور سماجی رویوں کا ذکر درحقیقت اِسی نظام کے خلاف نہ صرف نفرت بل کہ مزاحمت کا درس بھی دیتا ہے۔ یہ صورتِ حال ۱۸۵۷ء تک جاری و ساری رہی۔ اس عرصے میں زیادہ تر شعرا شہر آشوب کے ذریعے ہی مزاحمتی رویوں کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔ اگرچہ بعد میں نظیرؔ اکبر آبادی نے اپنی موضوعاتی نظموں کی مدد سے معاشرتی رویوں، طبقاتی نظام اور استحصالی نظام کے خلاف مزاحمتی عمل کو آگے بڑھایا۔

مذکورہ بحث و گفت گو سے پتا چلتا ہے کہ اردو ادب میں مزاحمت کی روایت کس قدر گہری، قدیم اور رچی بسی ہے۔ چناں چہ اردو ادب کا آغاز جس عہد سے ہوا، وہ سیاسی و اخلاقی انحطاط اور معاشی و تہذیبی زوال کا دور تھا۔ اٹھارویں صدی عیسویں کے آغاز میں مسلمانانِ برصغیر پاک و ہند پر زوال آنا شروع ہوا۔ تاہم سیاسی زوال و انحطاط کی تاریخ میں ۱۸۵۷ء کا سال ایک مرکزی نکتے کی حیثیت رکھتا ہے کیوں کہ اس سیاسی واقعے

کے بعد مسلمانانِ برصغیر اپنے قریباً چھے سو برس کے اقتدار سے محروم ہو گئے اور برطانوی نو آبادیات کے تحت غلامی کا دور شروع ہوا۔

اُنیس ویں صدی کے اردو ادب کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی سے قبل مزاحمتی رویے اس قدر عام نہیں تھے، جس طرح ۱۸۵۷ء کے سانحے اور بعد کے حالات نے شعرا کو متاثر کیا۔ اس وقت استعماری قوتیں پورے ہندوستان کے چپے چپے پر اپنا تسلط جما چکی تھیں۔ اہل برصغیر خصوصاً مسلم قوم پر عرصہ حیات تنگ اور تاریک کیا جا رہا تھا۔ اسی ضمن میں غالب نے اپنے عہد کی سنگینیِ حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ۱۸۵۹ء میں میر مہدی مجروح کے نام ایک خط میں احتجاج ریکارڈ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

؎ روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے[۲۰]

۱۸۵۷ء کے واقعے کے دوران میں منظرِ عام پر آنے والے شہر آشوب مرثیے سے قریب تر نظر آتے ہیں، جن میں مزاحمتی رویوں سے زیادہ غم و اندوہ کی کیفیت دکھائی دیتی ہے۔ اس دور میں جن شعرا نے شہر آشوب تخلیق کیے، ان میں مرزا غالبؔ، بہادر شاہ ظفرؔ، داغ دہلویؔ، صدر الدین آزردہؔ، قاضی فضل حسین افسردہؔ، برق لکھنوی کے علاوہ الطاف حسین حالیؔ کے نام قابل ذکر ہیں۔ مذکورہ شعرا نے دہلی کے حالتِ زار بیان کرتے ہوئے حقیقت میں استحصالی طاقتوں کے خلاف آواز بلند کرنے کی سعی کی ہے۔ اس آواز میں مزاحمت کی لے کم اور بین کا عنصر زیادہ غالب ہے۔

اسی طرح ۱۸۵۷ء کے پُر آشوب دور کے دوران میں کچھ شعرا نے نظمیہ آشوب کے علاوہ غزل کی مروجہ روایت کو بدل کر غزل کی ہیئت میں آشوبِ زمانہ کا خاکا کھینچتے ہوئے، مزاحمت کے عناصر ثبت کرنے کی کوشش کی۔ ان میں احسنؔ، داغؔ، شیفتہؔ، لطفؔ، مجروحؔ، سالکؔ اور حالیؔ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ اسی طرح بعض شعرا نے ہجو کی مدد سے مزاحمتی رویوں کا اظہار کیا۔ ان ہجو گو شعرا میں سوداؔ، میرؔ، بقاؔ، مصحفیؔ، رنگینؔ اور انشاؔ وغیرہ کے نام گنوائے جاسکتے ہیں۔ سوداؔ اور میرؔ نے معاشی اور سیاسی استحصالی رویوں کے خلاف قلم استعمال کرنے کی جسارت کی۔ مثال کے طور میرؔ کی ایک ہجو سے چند اشعار ملاحظہ ہو:

؎ خاک اڑتی ہے صبح سے تا شام
شام سے صبح تک ہے فکرِ طعام

رحم کی جا ہے حال تنگ انام
ایک دو ہوں تو لوں کسو کا نام
سینکڑوں کے نہیں جگر میں آہ[21]

اس کے بعد اردو میں موضوعاتی نظم نگاری کا باقاعدہ آغاز انیس ویں صدی میں ہوا، جس میں نظیرؔ، آزادؔ اور حالیؔ نے کلیدی کردار ادا کیا۔ جہاں نظیرؔ کے ہاں نیچرل شاعری کی توانا آواز دیکھنے کو ملتی ہے وہیں مزاحمت کے لطیف پیرائے بھی عیاں ہیں۔ نظیرؔ کے ہاں مزاحمت فرد سے منسلک ہے نہ کہ حکم رانوں سے بل کہ سماجی رویوں سے ہے۔ ان کی نظموں میں بین السطور اور واضح دونوں طرح سے مزاحمتی عناصر ملتے ہیں۔ اس لحاظ سے ''پیسے کی فلاسفی، آٹے دال کی فلاسفی، پیٹ کی فلاسفی، زر کی فلاسفی، روٹی کی فلاسفی اور آدمی کی فلاسفی جیسی نظموں میں مزاحمتی عناصر اجاگر ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر نظیر کی نظم ''مفلسی کی فلاسفی'' سے چند اشعار:

ے مفلس جو بیاہ بیٹی کا کرتا ہے بُول بُول
پیسا کہاں جو جا کے وہ لاوے جہیز مول
جورو کا وہ گلا ہے کہ ہو جیسے پھوٹا ڈھول
گھر کی حلال خوری تلک کرتی ہے ٹھٹھول[22]

انجمن پنجاب کے تحت ہونے والے مشاعروں کو چوں کہ حکومتی سرپرستی حاصل تھی اس لیے میں مزاحمتی عناصر تلاش کرنا لا حاصل عمل ہے۔ البتہ اُنیس ویں صدی کے آخری حصے میں اکبرؔ الہ آبادی کی شاعری مزاحمت کی آئینہ دار معلوم ہوتی ہے۔ اکبرؔ نے طنز و مزاح کے پیرایئے میں برطانوی استعماریت، ظلم و جبر اور مسلمانوں کے سیاسی و سماجی زوال کے خلاف آواز بلند کی۔

ے ظلم جتنے ہیں ہمیں پر وہ کیے جاتے ہیں
ہم بھی ایسے ہیں کہ اس پر بھی جیے جاتے ہیں[23]

ے وہ دلی احباب وہ مسجد کے ساتھی اب کہاں
دشمنوں کے دشمنوں سے گپ اڑایا کیجیے
ٹھیکہ داروں نے کیا نیلام قومی روح کو

چھاؤنی میں اب فقط روٹی کمایا کیجیے
مر رہا ہوں مجھ کو بد خواہی کی قوت ہی نہیں
خیر خواہی آپ ہی پر دم جتایا کیجیے
عیش کا بھی ذوق دیں داری کی شہرت کا بھی شوق
آپ میوزک ہال میں قرآن گایا کیجیے[۲۴]

بیس ویں صدی کے ربع اوّل میں الطاف حسین حالیؔ، مولانا شبلیؔ نعمانی، حسرؔت موہانی، سرورؔ جہاں آبادی، فانیؔ، تلوک چند محرومؔ، مولانا ظفر علی خاں اور محمد علی جوہر وغیرہ کا انگریز استعمار کے خلاف مزاحمتی رویہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ انھوں نے غزل و نظم دونوں کے ذریعے سے مزاحمتی رویے اجاگر کیے۔ جیسے حسرتؔ موہانی نے آزادی فکر کے فروغ کے لیے آواز بلند کی۔

ہے مشق سخن جاری، چکی کی مشقت بھی
اِک طُرفہ تماشا ہے حسرتؔ کی طبعیت بھی
جو چاہو سزا دے لو تم اور بھی کھیل کھیلو
پر ہم سے قسم لے لو کی ہو جو شکایت بھی[۲۵]

دیوانِ حسرتؔ سے اس طرح مزاحمتی شاعری کی بیسوں مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ مزید براں فانیؔ کی غزل میں زیرِلب مزاحمت جھلکتی ہے۔ جیسے:

جب قفس میں موسم گل کا تصور بندھ گیا
ہر طرف اجڑا ہوا اک آشیاں دیکھا کیے[۲۶]

بیس ویں صدی میں شعری ہیئت میں مزاحمت کے ساتھ ساتھ عوامی شعور نے بھی جنم لیناشروع کیا جس کی بناپر آزادی کے نعروں اور تحریک میں مزید جان آگئی۔ جدید نظم نگاری کو حالیؔ و اکبرؔ کے ساتھ ساتھ اقبالؔ نے بھی وسعت بخشی۔ علامہ اقبالؔ نے اپنی معرکہ الآرا نظموں مثلاً ''خطاب بہ نوجوانانِ اسلام''، ''خضر راہ''، ''شکوہ''، ''جواب شکوہ'' اور ''شمع وشاعر'' وغیرہ کی مدد سے مسلمانوں کے طرزِ عمل اور اِن کے رویوں کے خلاف بھرپور مزاحمت کی۔

ے زندگی کا راز کیا ہے، سلطنت کیا چیز ہے
اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیا خروش
ہو رہا ہے ایشیا کا خرقہ دیرینہ چاک
نوجوان اقوام نو دولت کے ہیں پیرائیہ پوش
گرچہ اسکندر رہا محرومِ آبِ زندگی
فطرت اسکندری اب تک ہے گرم ناؤ نوش
بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دینِ مصطفیٰ ﷺ
خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش[۲۷]

علاوہ ازیں اقبالؔ کی بہت سی نظمیں ایسی ہیں جن میں بلاواسطہ طور پر مغرب کے معاشی، معاشرتی، تہذیبی اور سیاسی نظام وافکار کو ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے۔ جیسے "کارل مارکس کی آواز"، "ابلیس کی مجلس شوریٰ"، "اشتراکیت"، "مغربی تہذیب"، "فقر وملوکیت" اور "فرنگ زدہ" وغیرہ کے نام اس ضمن میں گنوائے جاسکتے ہیں۔

علامہ اقبالؔ بیسویں صدی میں اردو شاعری کے افق پر ایک بھرپور اور توانا آواز بن کر ابھرے جن کے اثرات سے نہ صرف اُن کے معاصرین بچ سکے بل کہ بعد میں آنے والے شعرا پر بھی ان کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ اس حوالے سے حفیظؔ جالندھری، جوشؔ ملیح آبادی، مولانا ظفر علی خان کے نام گنوائے جاسکتے ہیں۔ ظفر علی خان نے آزادی کے نعرے بلند کرتے ہوئے مزاحمتی رویوں کا اظہار کیا۔ جوشؔ کے ہاں مزاحمت انقلاب کے آہنگ ورنگ میں رچی بسی ہے۔

ے اے ہند کے ذلیل غلامانِ سیاہ
شاعر سے تو ملاؤ خدا کے لیے نگاہ
اس خوف ناک رات کی آخر سحر بھی ہے
توپیں گرج رہی ہیں سر پہ خبر بھی ہے[۲۸]

اسی طرح حفیظؔ جالندھری کی شاعری میں مزاحمت تو موجود ہے لیکن اس کی لے میں بغاوت کے جذبات کار فرما نظر نہیں آتے۔ البتہ انھوں نے بعض مقامات پہ مزاحمتی انداز اپناتے ہوئے جو آزادی کے لیے نعرے لگائے، ان سے عصری حسیت واضح ہوتی ہے۔

اس کے بعد جدید شاعری میں ن م راشدؔ، ظہیر کاشمیری، فیض احمد فیضؔ، حبیب جالبؔ، جوشؔ ملیح آبادی اور احمد فرازؔ مزاحمت کی توانا اور مضبوط آوازیں ہیں۔ ان ادیبوں کی تخلیقات میں مزاحمتی رویوں اور احتجاج کی ایک بڑی وجہ مارشلائی دور کی کارستانیاں ہیں۔ ۱۹۵۸ء میں جنرل ایوب خان کا مارشل لا، ۱۹۶۹ء میں جنرل یحییٰ خان کا مارشل لا اور جنرل ضیاء الحق کے مارشل لا کے علاوہ جنرل مشرف کا مارشل لا جیسے اہم واقعات نے مزاحمتی رویوں کو فروغ دیا۔

اس عہد کے ادیبوں نے شعوری طور پر پاکستان کی نامساعد سیاسی اور سماجی صورتِ حال کے خلاف آواز بلند کی۔ فیضؔ، جالبؔ اور فرازؔ کی شاعری مزاحمتی ادب کی عمدہ مثال ہے۔ فیض احمد فیضؔ تاحیات ظلم و استبداد اور استحصال کے خلاف قلمی جہاد میں مصروف رہے۔ اس لحاظ ان کی نظمیں "طوق و دار کا موسم"، دامن یوسف، آج کی رات، تنہائی، یاد، لوح و قلم، زنداں کی ایک شام، ہم تو مجبور وفا ہیں، تین آوازیں، زنداں کی ایک صبح، لہو کا سراغ، دل دار دیکھنا، جشن کا دن اور نثار تیری گلیوں پہ قابل توجہ ہیں۔ مثال کے طور ان کی نظم "ترانہ" سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

؎ اے خاک نشینو! اٹھ بیٹھو ، وہ وقت قریب آپہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے ، جب تاج اچھالے جائیں گے
اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں اب زنداں کی خیر نہیں
جو دریا جھوم کے اٹھے ہیں، تنکوں سے نہ ٹالے جائیں گے
اے ظلم کے ماتو لب کھولو ، چپ رہنے والو چپ کب تک
کچھ حشر تو ان سے اٹھے گا ، کچھ دور تو نالے جائیں گے[۲۹]

فیضؔ نے آمریت کے دور میں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ انھوں نے زمانہ اسیری میں کافی عرصے تک قید تنہائی اور اس کے بعد دوسری نوعیت کی تکالیف کو برداشت کیے رکھا۔ جو جیل میں ان کے لیے مقرر تھیں۔ زمانہ قید کی نظموں جیسے "یہ فصل امیدوں کی ہم دم" میں مزاحمت کی وہی مرحلہ وار لہریں

ہیں۔اسی طرح زندانی عہد کی نظموں میں ''آج بازار میں پابجولاں چلو'' جیسی نظم بھی شامل ہے جس میں حکومت پر تنقید بھی ہے اور فکر و جذبے کی شورش بھی۔ یہ جنرل ضیاء الحق کا مارشلائی دور تھا، جس میں فیضؔ نے ''یہاں سے شہر کو دیکھو'' نظم لکھی۔ جس میں فوجی حکومت کی زیادتیوں کے خلاف ایک اہم اور توانامزاحمتی اظہار کیا۔

جو رنگ ہر درو دیوار پر پَریشاں ہے
یہاں سے کچھ نہیں کِھلتا ، یہ پھول ہیں کہ لہو[30]

اسی طرح ن۔ م راشدؔ کا مزاحمتی تیور ان کی نظموں ''شاعر درماندہ''، شرابی، حسن کوزہ گر ''طلسم ازل''، دریچے کے قریب، ''تیل کے سوداگر''، ''دست ستم گر''، رقص، مکافات، انسان، گناہ، خلوت میں جلوت، سیاہی، نمرود کی خدائی، وزیرے چنیں، زنجیر، انسان، من و سلویٰ میں جھلکتا نظر آتا ہے۔ ان کے مجموعے ''ایران میں اجنبی'' میں کثیر تعداد میں نظمیں نو آبادیاتی نظام کے جبر واستبداد کے شکار عام آدمی کے جذبات کی عکاسی کرتی ہیں۔راشدؔ کی دور آمریت کی نظموں میں ''آنکھیں کالے غم کی'' خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

اندھیرے میں یوں چمکیں آنکھیں کالے غم کی
جیسے وہ آیا ہو بھیس بدل کر آمر کا
آنے والے جابر کا!
سب کے کانوں میں بن ڈالے مکڑی نے جالے
سب کے ہونٹوں پر تالے
سب کے دلوں میں بھالے!
اندھیرے میں یوں چمکے میلے دانت بھی غم کے
جیسے پچھلے دروازے سے آمر آدھمکے[31]

پاکستان کی تاریخ کے مارشلائی عہد میں آمرانہ حکومت کے خلاف سب سے مؤثر اور توانا آواز حبیب جالبؔ کی ثابت ہوتی ہے۔انھوں نے اس دور کی آمرانہ حکومت کے دستور (۱۹۶۲ء کے آئین) کے خلاف اپنی نمائندہ نظم ''دستور'' تخلیق کی۔ یہ نظم مکمل طور پر احتجاج اور مزاحمت کا رنگ لیے ہوئے ہے۔مثال کے طور پر اس نظم سے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

دیپ جس کا محلات ہی میں چلے
چند لوگوں کی خوشیوں کو لے کر چلے
وہ جو سائے میں ہر مصلحت کے پلے
ایسے دستور کو صبح بے نور کو
میں نہیں مانتا ، میں نہیں جانتا
تم نے لوٹا ہے صدیوں ہمارا سکوں
اب نہ ہم پر چلے گا تمھارا فسوں
چارہ گر میں تمھیں کس طرح سے کہوں
تم نہیں چارہ گر ، کوئی مانے ، مگر
میں نہیں مانتا، میں نہیں مانتا[۳۲]

حبیب جالبؔ کی مزاحمتی نظموں میں "ماں"، "مادر ملت"، "بیس گھرانے"، "ریفرنڈم"، "ایک نہتی لڑکی"، نیلو، "پابہ زنجیر"، "رقص"، "بھیک نہ مانگ" اور "خطرے میں اسلام نہیں" وغیرہ قابل توجہ ہیں۔ جالبؔ پاکستان میں معاشرتی عدل وانصاف، آزادی تحریر وتقریر، روشن مستقبل اور خوب صورت روایات کے امین رہنے کے خواہش مند تھے۔ بایں ہمہ حبیب جالبؔ کی ساری شاعری اپنے عہد کے جبر کے خلاف مزاحمت کی ایک جان دار داستان ہے۔

احمد فرازؔ کی شاعری میں بھی مزاحمتی رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ فرازؔ ظلمت کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ ان کی شاعری میں استحصالی نظام، انسان کی بے توقیری، انسانیت کی بے حرمتی، جمہوریت کی پامالی اور جبر واستبدادی قوتوں کے خلاف مزاحمت کا اظہار پایا جاتا ہے۔ احتجاج اور مزاحمت ان کی شاعری کا خاصا ہے۔ ان کی نظمیں گھٹن زدہ سماج میں ایک روشن کرن معلوم ہوتی ہیں۔ انھوں نے آمریت کے دور میں مزاحمتی اور انقلابی رویوں کا بھرپور اظہار کیا۔ مزید براں انھوں نے آزادی رائے، انسانی اقدار اور انسانی مسائل پر خوب کھل کر قلم استعمال کیا۔

احمد فرازؔ کے کلام میں بے شمار ایسی نظمیں اور غزلیں مل جاتی ہیں، جن میں وہ ریاستی جبر واستبداد کے خلاف مسلسل محاذ آرائی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کی نظمیں "محاصرہ"، "چلو اس شہر کا ماتم کریں"، "اے بھوکی مخلوق"، "اے مرے وطن کے خوش نواؤں"، "خیر مقدم"، "قاتل" اور "یہ کھیت

ہمارے ہیں اور یہ کھلیان ہمارے ہیں" عمدہ مثالیں ہیں۔اسی طرح جب ضیاء الحق نے مارشل لا لگایا اور تمام سیاسی جماعتوں کو کالعدم قرار دیا۔ سرکار کی طرف سے حکم ہوا کہ کوئی بھی سیاسی جماعت سے منسلک نہ کہلائے اور خلاف ورزی کی صورت میں ۱۴ سال قید اور ۲۵ کوڑے برسانے کی سزا سنائی گئی تو ہر طرف لوگوں میں دہشت اور وحشت پھیل گئی۔ فرازؔ نے اس عہد کی بربریت کی بہ ذیل شعر میں تصویر کشی کی ہے۔

؎ اس قدر خوف ہے ، اب شہر کی گلیوں میں کہ لوگ
چاپ سنتے ہیں تو لگ جاتے ہیں دیوار کے ساتھ[۳۳]

اسی طرح احمد ندیم قاسمی کی شاعری میں بھی سیاسی، مذہبی اور اقتصادی جبر کی مزاحمت واضح ہے۔ اس حوالے سے ان کی نظم "کرب نامہ"[۳۴] زیادہ اہم ہے۔اس میں احمد ندیم قاسمی نے کھل کر جبر کے خلاف اظہار کیا ہے۔علاوہ ازیں پاکستان میں جدید شعرائے اردو میں ظفر اقبال، شہرت بخاری، احسن علی، جاوید شاہین، تبسم کاشمیری، سرمد صہبائی، افتخار عارف، انوار فطرت، تاج سعید، انجم خلیق، جمیل ملک، اقبال حیدر، اصغر ندیم سید، خالد اقبال یاسر، ستار سید، مسعود منور کے علاوہ شاعرات میں اداؔ جعفری، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، پروین شاکر، عذرہ عباس، نسیم سید، سارہ شگفتہ، شبنم شکیل اور یاسمین حمید وغیرہ نے سیاسی و سماجی جبر و استبداد کے خلاف اپنی شاعری کے ذریعے سے مزاحمتی اظہار کیا۔

اگر ہم پاکستانی تاریخ کا بہ غور جائزہ لیں تو ہمیں شروع سے عوامی محاذ پر قریباً ملتے جلتے استحصالی رویوں کا سامنا رہا، کہیں جاگیر دار اور مزارعے کی چپقلش، کہیں سرمایے دار اور محنت کش طبقے کی کش مکش، کہیں کم زور اور طاقت ور کی جنگ، کہیں روز گار اور دیگر بنیادی سہولتوں کی عدم دستیابی اور کہیں دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کے خلاف شعرائے اردو نے اپنا زور قلم خوب صرف کیا۔ کئی ایک شعرا نے مزاحمت کے لیے تجریدی و علامتی انداز اپنایا، ان میں مجید امجد، احمد ندیم قاسمی، منیر نیازی، عرش صدیقی، احسان دانش، مختار صدیقی، اختر حسین جعفری، افتخار جالب، اختر الایمان وغیرہ بہ طور خاص شامل ہیں۔ جب کہ ہندوستان میں ساحر لدھیانوی، عمیق حنفی، جگن ناتھ آزاد، منوررانا، کیفی اعظمی، بلراج کومل وغیرہ نے استعارتی انداز کے ساتھ ساتھ تجریدی نظام کو نظم کا حصہ بناتے ہوئے مزاحمتی رویوں کا اظہار کیا۔

د۔ آزاد کشمیر میں اُردو شاعری کی مختصر روایت

آزاد کشمیر میں اردو شاعری کی روایت خاصی قدیم اور توانا دکھائی دیتی ہے۔اس خطے میں میر پور (آزاد کشمیر) سے تعلق رکھنے والے غلام محی الدین میر پوری کی مثنوی "گل زار فقر" جو کہ اٹھارویں صدی کے ربع اول کی تخلیق ہے، سے شعری روایت کا آغاز ہوتا ہے۔ آزاد کشمیر کے شاعری کے فروغ میں اولین کردار ادا کرنے والے شعرا میں وہ مہاجر شعرا شامل ہیں جھنوں نے ۱۹۴۷ء کے فسادات میں اپنے آبائی وطن کو خیر آباد کہہ کر آزاد کشمیر کے آزاد علاقے کو اپنا مسکن بنایا۔مقبوضہ وادی سے آنے والے اِن شعرا میں عبدالعزیز، اسماعیل ذبیح، غلام علی بلبل، چراغ حسن حسرت، غلام احمد کشفی، بشیر صرفی، جمیل نظامی، تحسین جعفری، احمد شمیم، تبسم بینائی، خواجا بشیر احمد، رانا محمد شریف، جمیل نظامی، اسماعیل راجوروی، شفقت تنویر مرزا، قاضی شمس الدین، مولوی محمد حسن، رانا نظامی اور امین طارق قاسمی کے علاوہ برصغیر کے دیگر علاقوں سے ہجرت کر آزاد کشمیر میں رہائش پذیر ہونے والے شعرا میں عبدالعلیم صدیقی، اکرم طاہر اور خمار دہلوی کے نام زیادہ معروف ہیں۔

گو کہ آزاد کشمیر میں اُردو شعری ادب نے خاصی ترقی کی اور ہر صنف شعر کو فروغ حاصل ہوا۔ لیکن اس شعری روایت کی ترویج و ترقی میں دو مراکز میر پور اور مظفر آباد خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ مظفر آباد آزاد کشمیر کا دارالحکومت ہونے کی توسط سے ادبی مرکز کہلاتا ہے۔ ان دونوں علاقوں نے اُردو ادب کی کئی قد آور شخصیات کو جنم دیا۔ جو نہ صرف ملکی بل کہ بین الاقوامی سطح پر بھی اہم مقام رکھتی ہیں۔

میر پور ڈیژون کے نمائندہ شعرائے اردو میں نذیر انجمؔ، محمد رفیق بھٹی، بشیر مغل، عابد محمود عابد، فضل حسین کیف، پروفیسر صغیر آسی، پروفیسر شفیق انجمؔ، مشتاق شاد، بوٹا خان راجس، اکرم سہیل، زکریا شاذ کے علاوہ منصور راٹھور، توقیر گیلانی، احسن سلیمان، مسعود ساگر، مجید مہر اور راز احتشام کے نام شامل ہیں۔اسی طرح پونچھ ڈیژون کے شعرائے اردو میں عبدالغنی غنی، اسلم راجا، پروفیسر شفیق راجا، اسرار ایوب، جاوید سحر، احمد عطاء اللہ، ایاز عباسی، الطاف عاطف، سید شہباز گردیزی، ڈاکٹر ماجد محمود ماجد، جمیل اختر جمیل، آصف اسحاق، ضیاء الرحمان ضیا، صداقت طاہر، عثمان لیاقت، شوزیب کاشر، فاروق صابر، لیاقت شعلان، بشارت تنشیط، تقویم طاہر، عاصم سلیم بٹ اور ظہور منہاس قابل توجہ ہیں۔

اسی طرح مظفر آباد ڈیژون کے نمایندہ شعرائے اردو میں آزر عسکری، الطاف قریشی، ڈاکٹر صابر آفاقی، محمد خان نشتر، ڈاکٹر افتخار مغل، مخلص وجدانی، زاہد کلیم، ناز مظفر آبادی، ابراہیم گل، ایم یامین، ندیم حیدر بخاری، ڈاکٹر آمنہ بہار، محمد نثار ہمدانی، اعجاز نعمانی، جواد جعفری، جاوید الحسن جاوید، واحد اعجاز میر، وقار احمد میر، عبدالبصیر تاج ور، اقبال اختر نعیمی اور لطیف آفاقی اہم ہیں۔ آزاد کشمیر کی شعری روایت کو جن شعرا نے تقویت بخشی ان میں سے چند معروف شعرا کا ذکر مع نمونہ کلام بہ ذیل کیا جاتا ہے۔

عبدالعلیم صدیقی (۱۹۲۵ء تا ۲۰۰۹ء) کا شمار آزاد کشمیر کے اولین شعرا میں ہوتا ہے، انھوں نے اقبال کے فارسی کلام کا اردو میں منظوم ترجمہ کرنے کے ساتھ ساتھ سعدی شیرازی اور عمر خیام کے فارسی کلام کا بھی اردو میں منظوم ترجمہ کیا۔ مزید براں اُن کا اپنا طبع زاد شعری مجموعہ ''نہاں خانہ دل'' کے نام سے منصہ شہود آیا۔ اس مجموعے میں غزلیں اور نظمیں دونوں شامل ہیں۔ ان کی معروف نظموں میں ''جاگ اٹھا کشمیر''، مجاہدین کشمیر، جوتے کی مار اور برف باری وغیرہ نمایاں ہیں۔

ے تمھارا جذبہ جہاد بے کراں و نا شکیب
تمھارا عزم انقلاب صبح تازہ کا نقیب
فراز ہو چلی شب طویل و تیرہ و مہیب
تمام جگ مگا اٹھے گا کیا فراز کیا نشیب
وطن کی ساری بستیوں کا جاگ جائے گا نصیب
قدم اٹھاؤ تیز تر کہ منزل آ گئی قریب[۳۵]

امین طارق قاسمی اور اکرم طاہر کا شمار تقسیم ہند کے موقعے پر خطہ آزاد کشمیر کی طرف ہجرت کرنے والے شعرا میں ہوتا ہے۔ اول الذکر کی رزمیہ مثنوی ۱۹۶۵ء میں ''جہاد کشمیر'' کے نام سے طبع ہوئی۔ اس میں کشمیر کی تاریخ اور اس حوالے سے قابل ذکر واقعات کو بھی منظوم شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ جب کہ موخر الذکر کے دو غزلیہ مجموعے زیور طبع سے آراستہ ہوئے۔ علاوہ ازیں ان کا ایک نظمیہ شعری مجموعہ ''بچوں کی نظموں'' کے نام سے منظر عام پر آیا۔ جب کہ مختلف رسائل و جرائد میں طبع ہونے والی نظمیں اس پہ مستزاد ہیں۔ ان کی نظموں میں ہجرت، تنہائی، ماضی کی یاد اور ۱۹۴۷ء کے فسادات وغیرہ کا ذکر خصوصیت کا حامل ہے۔ مثال کے طور پر بہ ذیل اشعار:

ے سقوط ڈھاکہ کے سانحہ پر زوال بغداد یاد آیا
شکست کے اس مہیب لمحے، شکوہ اجداد یاد آیا
وہ مسجد قرطبہ کی عظمت،وہ ارض بیت اللحم کی شوکت
لٹے تو ماضی کا ہم کو اک اک نشانِ برباد یاد آیا[۳۶]

آزر عسکری (۱۹۱۴ءتا۱۹۸۳ء) آزاد کشمیر کے مزاح گو شاعر ہیں۔ ''کشتِ زعفران'' کے نام سے ان کا مزاحیہ شعری مجموعہ ۱۹۷۶ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ ان کے مزاح میں وہ تمام خوبیاں موجزن ہیں جو کہ ایک پختہ گو شاعر کے مزاح میں موجود ہونی چاہیں۔ ان کے ہاں عمدہ تضمین، طنزیہ اسلوب، مزاح براح اصلاح پایا جاتا ہے۔ ان کی شاعری میں مزاحیہ اسلوب میں مزاحمتی رویے بھی جھلکتے ہیں۔

مزید براں آزاد کشمیر کی شعری روایت میں الطاف قریشی (۱۳، نومبر ۱۹۳۷ءتا۱۹۹۵ء) کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ ان کے اردو شعری مجموعوں میں ''داتا زہر پلا''، ثنا، اور ''شہر زندگی'' بہ طور خاص شامل ہیں۔ اس کے علاوہ الطاف قریشی کا اچھا خاصا کلام غیر مطبوعہ بھی ہے۔ الطاف قریشی گورنمنٹ کالج مظفر آباد کے ادبی مجلے ''دومیل'' اور گورنمنٹ کالج میرپور کے ادبی مجلے ''سروش'' کے مدیر بھی رہے۔ ان مجلات میں بھی ان کا کلام طبع ہوتا رہا۔ ان کی شاعری میں فطرت اور وطن عزیز کا احساس، زندگی اور موت کا ذکر، نفسیاتی و سماجی مسائل کا شعور، آزادی و غلامی اور انسانیت کی قدر وغیرہ اہم موضوعات ہیں۔

ے دنوں کے اندر بھی سناٹا باہر بھی خاموشی ہے
موت کا بھاری قفل پڑا ہے نگر کے باہر مکانوں پر[۳۷]

ڈاکٹر صابر آفاقی (۱۹۳۳ءتا۲۰۱۱ء) آزاد کشمیر کے اہم شاعر ہیں۔ ان کا تعلق ضلع مظفر آباد سے ہے۔ انھوں نے تہران یونی ورسٹی، ایران سے ۱۹۷۲ء کو ادبیات میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ان کی مجموعی طور پچاس کے لگ بھگ کتب سامنے آئیں۔ ان کے اردو شعری مجموعوں میں ''خندہ ہائے بیجا''، ''طلوع سحر''، ''شہر تمنا''، ''ثنائے بہا''، ''سارے جہاں کا درد'' اور ''زمزمہ روح'' قابل ذکر ہیں۔ ان کی نظم '' جنگ '' سے ایک بند ملاحظہ ہو:

بقائے ذات کی ہے جنگ ایسی
کہ اس میں لڑتے لڑتے

آدمی مفقود ہو جائے[38]

ڈاکٹر افتخار مغل (۱۹۶۱ء تا ۲۰۱۱ء) بھی آزاد کشمیر کے شعری منظر نامے پر ایک اہم شاعر کے طور پر نظر آتے ہیں۔ انھوں نے علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد سے ایم فل (اردو) اور پی ایچ ڈی (اردو) کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ان کی شعری تصانیف میں ''لہو لہو کشمیر'' اور ''انکشاف'' شامل ہیں۔ علاوہ ازیں نثری تصانیف میں بھونچال، آزاد کشمیر میں اردو شاعری قابل ذکر ہیں۔ ان کی شاعری میں وطن سے گہری محبت، آزادی کی تڑپ، مزاحمت، خودداری، معاشرت اور تاریخ جیسے موضوعات اہم ہیں۔ مثال کے طور پر بہ ذیل ایک قطعہ ملاحظہ ہو جس میں وہ ضمیر عالم کو دعوت فکر دیتے دکھائی دیتے ہیں:

؎ فروغِ حرمتِ انسانیت کے دعوے بجا!
چنار دیس کی نسبت یہ بے بسی کیوں ہے
اِدھر بھی ایک نظر، امن کے پرستارو
ہمارے باب میں آخر یہ بے حسی کیوں ہے[39]

نذیر انجم (جنوری ۱۹۶۴ء تا ۲۰۱۲ء) آزاد کشمیر کی شعری روایت میں مکمل طور پر مزاحمتی رجحان کے حامل شاعر ہیں۔ ان کا تعلق میرپور سے ہے۔ نذیر انجم کے پانچ شعری مجموعے جن میں پلک پلک زنجیر، نفس نفس زنجیر، دھواں دھواں تحریر، کرن کرن تصویر اور لہو لہو کشمیر شامل ہیں۔ ان کا کلیات بھی ۲۰۱۱ء میں ''قرضِ سخن'' کے نام سے منصہ شہود پہ آیا جس میں متذکرہ پانچوں شعری مجموعوں کو جگہ دی گئی ہے۔ ان کی شاعری میں مزاحمت، حب الوطنی، آزادی، غلامی سے نجات، انقلاب وغیرہ اہم موضوعات ہیں۔ بہ ذیل نذیر انجم کا ایک قطعہ ملاحظہ ہو جس میں ان کا مزاحمتی رنگ واہوتا ہے۔

؎ ظلم کو امن، عداوت کو وفا کہتے ہیں
کیسے ناداں ہیں صرصر کو صبا کہتے ہیں
میرے کشمیر! ذرا جاگ کہ کچھ جاہ طلب
غیر کو تیرے مقدر کا خدا کہتے ہیں[40]

اسی طرح رفیق بھٹی بھی آزاد کشمیر کے شعری افق پر بہت اہم شاعر ہیں۔ رفیق بھٹی کا تعلق میرپور آزاد کشمیر سے ہے۔ ان کی تصانیف میں ''ستون دار'' اور ''لہو نگر'' نظمیہ شعری مجموعے ہیں۔ ان کا فکری

رجحان بھی مزاحمت کی طرف زیادہ ہیں۔ان کی شعری فکر میں کشمیر سے محبت ، وطن کی یاد اور قوم پرستانہ خیالات اہم ہیں۔

؎ تحریک حریت کا اک قافلہ رواں ہے
خوش بو لہو نگر کی ہر سو کشاں کشاں ہے
ہر غنچہ شعلہ داماں ، ہر گل شرر فشاں ہے
دشمن اماں طلب ہے، وحشت شکستہ جاں ہے
منزل شہادتوں کیا اب جگ مگا رہی ہے
زنجیر ٹوٹنے کی آواز آ رہی ہے[۴۱]

بشیر احمد مغل آزاد کشمیری کی شعری روایت میں اہم حیثیت رکھتے ہیں۔یہ میرپور میں سکونت پذیر رہے۔ان کے درجن سے زائد شعری مجموعے طبع ہوئے۔جن میں سے ''شام زندگی''، ''صبح زندگی''، ''رہرو تنہا''، ''برگ آوارہ''، ''کشتِ لالہ و گل''، ''دشت طلب''، ''دریادریا،ساحل ساحل''، ''حلقہ میری زنجیر کا''، ''ڈوبتے منظر''،''شہر دربدراں''اور ''تہہ محراب حرم'' زیادہ قابل توجہ ہیں۔حبِ کشمیر ان کی شاعری کا خاصا ہے۔ان کے جہاد کشمیر کے حوالے سے یہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں:

؎ مرد ہے جو آگ اور خون کا تیر کے دریا پار کرے
مرد وہ جو سر دھڑ دے کر حق کی راہ ہموار کرے
مرد نہیں جو باطل کی یلغارِ ستم سے دبتا پھرے
مرد ہے جو دست و پا سے ہر باطل پہ وار کرے
مرد نہیں جو مومن کی ناموس کو لٹتا دیکھ سکے
مرد ہے جو ملت کی ناموس کا بیڑا پار کرے[۴۲]

محمد خان نشتر (۱۹۲۷ء تا ۱۹۹۵ء) کا تعلق مظفر آباد سے ہے،انھوں نے آزاد کشمیر میں اردو شعر و ادب میں نمایاں کردار ادا کیا۔ان کی تصانیف میں ''رشحات نشتر'' (تاریخ) اور ایک شعری مجموعہ ''لمحات نشتر'' یاد گار ہیں۔ان کی نمایاں نظموں میں چودہ اگست، علامہ اقبال، یومِ قرارداد پاکستان اور پیمان وفا اہم ہیں۔بہ ذیل شعر ان کی پہچان بنا۔

؎ نشترؔ بہت دکھاتے تھے دم خم حیات میں
یہ کیا ہوا کہ ایک ہی ہچکی میں سو گئے[۴۳]

سیدہ آمنہ بہار آزاد کشمیر کے شعری منظر نامے میں بلند مقام رکھتی ہیں۔ آمنہ بہار خاندانی طور پر علم وادب سے شغف رکھتی ہیں۔ آمنہ بہار کا پہلا شعری مجموعہ "چناروں کی آگ"۱۹۸۷ء میں زیور طبع سے آراستہ ہو کر ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل کر چکا ہے۔ان کی شاعری میں سیاسی، سماجی، نفسیاتی مذہبی اور عصری عناصر، رجائیت سمیت مزاحمتی عناصر جیسے مضامین ملتے ہیں۔ آمنہ بہار تخلیقی سرمائے کے اعتبار سے بہترین لب ولہجے کی شاعرہ ہیں۔ اگرچہ آمنہ بہار نے اپنے ادبی سفر کا آغاز تو نظم سے کیا لیکن غزل ان کی شہرت و پہچان کا باعث بنی۔

؎ جن کی آزادی کی خواہش کب سے ہو گرم سفر
برف زاروں کے فرو تر سلسلوں کو چوم لوں[۴۴]

اسی شعری روایت کے ایک اور شاعر عابد محمود عابد کا تعلق میرپور سے ہے۔درس وتدریس کے شعبے سے وابستہ ہیں۔ان کا اولین شعری مجموعہ "اُداس ہنس لیں" کے نام سے ۲۰۲۱ء میں منصۂ شہود پہ آیا۔عابدؔ کا یہ مجموعہ کلام فکاہی ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ ان کے شعری موضوعات میں عہدِ حاضرے مسائل، ٹیکنالوجی کی حساسیت پر قابو، مصنوعی معاشرتی نظام، عائلی زندگی، نوجوانوں کی جذباتی زندگی اور مختلف شعبہ ہائے زندگی میں اناڑیوں کی اجارہ داری وغیرہ محبوب موضوعات ہیں۔ ان کی شاعری میں بشاشت اور ظرافت کا حسیں امتزاج پایا جاتا ہے۔ان کی شاعری میں مزاحیہ اسلوب جابہ جا نظر آتا ہے۔عابدؔ کی شاعری میں نظم وغزل دونوں میں برابر طنز ومزاح کے حربوں سے ظرافت پیدا کی ہے۔شاعر نے نظم کی طرح غزل میں بھی طنز ومزاح کے جوہر دکھائے ہیں۔ بہ ذیل چند اشعار بہ طور مثال ملاحظہ ہوں:

؎ جو پوچھا اِک حسینہ کو کہاں سے مال آتا ہے
وہ بولی مسکرا کر میرے ابّا جان لوٹے ہیں[۴۵]

؎ علم کی شمع سے روشن ہے محبت کی شمع
روز جاتی ہے "ٹیوشن" کو مگر شام کے بعد[۴۶]

؎ میری "چک" کی دوا کرے کوئی
"ابنِ مریم ہوا کرے کوئی"[47]

مزید براں مخلص وجدانی جن کا تعلق ضلع مظفر آباد سے ہے،اس شعری روایت کو آگے بڑھاتے ہیں۔یہ ڈاکٹر صابر آفاقی کے چھوٹے بھائی ہیں۔ مخلص وجدانی اردو اور گوجری دونوں زبانوں میں مشق سخن جاری رکھے ہوئے ہیں۔ان کے شعری سرمائے میں "پیار کے پھول"، "نئ بہار کے پھول"، "بوئے پیر ہن" اور "صلیبوں کے شہر" قابل ذکر ہیں۔ مخلص وجدانی کی شاعری میں گردو پیش کا غم، مجبوری اور بے بسی کا ذکر، وطن سے محبت، مقامی علامات واستعارات وغیرہ جابہ جا نظر آتے ہیں۔ مثلاً ان کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

؎ آؤ سب مل کر فصیل شہر کو اونچا کریں
ہے سلامت شہر تو محفوظ اپنا گھر بھی[48]

جاوید الحسن جاوید آزاد کشمیر کی شعری روایت میں اہم حیثیت رکھتے ہیں۔ان کی شاعری میں نظم اور غزل دونوں شامل ہیں۔ان کے شعری مجموعوں میں "محبت پھول کی مانند"، "پون"، "گل وگلزار کا موسم"، "ابھی نظمیں ادھوری ہیں" اور "مہجور مدینہ" طبع ہو چکے ہیں۔ان کی شاعری میں حقیقت نگاری کو خاص اہمیت حاصل ہے۔مزید براں دھرتی ماں سے گہری انسیت، آزادی کی تڑپ نمایندہ موضوعات ہیں۔ جاوید الحسن جاوید کی شاعری میں اپنے وطن سے محبت بھی عیاں ہے۔وطن سے محبت ان کا خاص موضوع ہے ان کی نظم "وطن سے گیت" کا ایک بند ملاحظہ ہو:

؎ میری سوچوں کی تنویر میرا وطن
میرے خوابوں کی جاگیر میرا وطن
اب نہیں کوئی غم میری تقدیر میں
دشت غم میں عناں گیر میرا وطن
سر زمین وطن ہے محبت مری
اک پھول کی مانند ہے میری ارضِ وطن بھی
اب پھول کو خوش بو سے ورا کیسے کرے گی[49]

اسی طرح اسلم راجا بھی آزاد کشمیر کی شعری روایت میں ایک خاص شناخت رکھتے ہیں۔ ضلع باغ ان کی جنم بھومی ہے۔ ان کی شاعری میں دیگر خصائص کے ساتھ ساتھ تشبیہات میں بھی ندرت موجود ہے۔ مثال کے طور پر بہ ذیل شعر اس کی خوب صورت عکاسی کرتا ہے۔

ے رنگوں میں میری رنگت ،خوش بو سے میری نسبت
میں باغ پالتا ہوں، باسی ہوں عدن کا[۵۰]

جواد جعفری کا تعلق ضلع باغ سے ہے لیکن ہنوز وہ مظفر آباد میں سکونت پذیر ہیں۔ ان کی شاعری کے حالات حاضرہ پر گہری نظر، اپنی دھرتی ماں سے محبت، اپنی مٹّی سے انسیت خاص موضوعات ہیں۔ ''احتجاج'' کے نام سے ان کا اولین شعری مجموعہ منظر عام پر آچکا ہے۔

اسی روایت کے ایک اور اہم شاعر ناز مظفر آبادی ہیں۔ انھیں کم سنی سے ہی شعر گوئی کی طرف رحجان رہا۔ نظم و غزل دنوں اصناف سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ نظم گوئی میں خاص مقام رکھتے ہیں۔ ناز مظفر آبادی کے شعری مجموعوں میں ''ہم سخن''، ''حرف آشنا''، ''سر گوشی'' طبع ہوئے۔ ان کی شاعری حقیقت اور خوب صورت جذبات کی عکاسی کرتی ہے۔

پروفیسر شفیق راجا آزاد کشمیر کے شعر و ادب کی روایت میں اپنی ایک الگ پہچان رکھتے ہیں۔ آزاد کشمیر کے مختلف کالجز میں تدریسی فرائض بہ احسن و خوبی انجام دیے۔ بہ طور پرنسپل ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ شفیق راجا کی شاعری میں ''کشمیر'' ایک خوب صورت حوالہ ہے۔ ان کے ہاں جذبہ حب الوطنی خوبی کے ساتھ جھلکتا ہے۔ مزید براں ان کا شعری اسلوب عام فہم ہے۔ ''حرف حرف سمیٹوں'' کے نام سے پہلا شعری مجموعہ ۱۹۹۸ء میں منصہ شہود پہ آیا اور بھرپور داد و تحسین کا مستحق قرار پایا۔ ان کے کلام سے ایک شعر ملاحظہ ہو:

ے ستم کی، ظلمت کی ماری ہوئی رُتیں کب تک
مرے وطن تیری قسمت میں ظلمتیں کب تک[۵۱]

واحد اعجاز میر آزاد کشمیر کے ادبی منظر نامے کے اہم شاعر ہیں۔ ان کا تعلق ضلع مظفر آباد سے ہے۔ ان کے دو شعری مجموعے ''راستہ مت بدل'' ۲۰۰۴ء میں اور ''آوا گون'' ۲۰۱۵ء میں زیور طبع سے آراستہ

ہوئے۔ واحد اعجاز کی شاعری میں ندرت، تازگی، نغمگی، مزاحمت، مذہبی عناصر، کشمیر سے لگاؤ اور واقعہ کربلا کا ذکر وغیرہ خوب جھلکتا ہے۔ ان کے کلام سے بہ ذیل دو اشعار مثال کے طور پر ملاحظہ ہوں:

ے یہ جو گرنا سنبھلنا ہے اِس میں ندامت کی کیا بات ہے
اپنے پاؤں پہ گر، اپنے ہاتھوں سنبھل، راستہ مت بدل[۵۲]

ے ہم نے نیلم اور جہلم میں لاشے آتے دیکھے
سنتے تھے ان دریاؤں میں سونا آتا ہے[۵۳]

اسی طرح شہباز گردیزی بھی آزاد کشمیر کی ادبی منظر نامے پر خاص مقام رکھتے ہیں۔ شاعری میں انھوں نے ڈاکٹر افتخار مغل اور پروفیسر شفیق راجا سے اصلاح لی۔ ان کی شعری تصانیف میں ''حقیقتوں کے عذاب''، ''خواب کون دیکھے گا'' کے علاوہ ضلع پونچھ کے شعرا کا انتخاب ''اجلی مٹّی'' شامل ہیں۔ آزادی کا خواب، امن و آتشی کا خواب، وطن سے محبت وغیرہ ان کی شاعری کا خاصا ہیں۔ کشمیر کے حوالے سے بہ ذیل شعر بہ طور مثال پیش کیا جاتا ہے:

ے ساری دنیا میں جنت کی ایک یہی تصویر
یہ جموں کشمیر ہے بھائی یہ جموں کشمیر[۵۴]

مزید براں زکریا شاذؔ آزاد کشمیر کے ادبی منظر نامے کے معروف شاعر ہیں۔ شاذؔ کا شعری مجموعہ ''خاموشی کی کھڑکی سے'' ۲۰۱۳ء میں منظر عام پر آیا۔ ان کے کلام میں داخلیت اور خارجیت کے ساتھ ساتھ کلاسیکیت کا رنگ بھی جھلکتا ہے۔ محبت کے موضوع کو انھوں نے کئی حوالوں سے برتا ہے۔ زبان و بیان کے لحاظ سے بھی ان کا کلام عمدہ ہے۔ ان کے ہاں فنی و فکری اوصاف موجزن ہیں۔ ان کی غزل سے متعلق ڈاکٹر وزیر آغا یوں رقم طراز ہیں:

> ''زکریا شاذؔ کی غزل جدید لب و لہجہ کی حامل ہے۔ کہیں بھی شاعر کی بھیگی ہوئی آواز جذباتی خروش میں تبدیل نہیں ہوئی۔ ایک موہوم سی کسک غزل کے تاروپود میں رچی بسی ہوتی ہے۔ زکریا شاذؔ نے غزل کی عام اور پامال روش سے ہٹ کر بات کہنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے نہ صرف معاملات کو اپنی نظر سے دیکھا ہے بل کہ انھیں منقلب کر کے معنی خیز بھی بنایا ہے۔''[۵۵]

ان کے کلام سے ان کی شعری خصوصیات واہوتی ہیں۔ ان کے نزدیک اشعار کی کثرت ضروری نہیں بل کہ معانی وخیال کا حامل ایک شعر بھی کسی شاعر کے لیے کافی سمجھتے ہیں۔

؎ شعر اچھا ہو تو اک ہی کافی

لوگ دیوان لیے پھرتے ہیں[56]

؎ اِک وقت کہ وقت اپنا گزرتا ہی نہیں تھا

اب وقت کی رفتار سے تنگ آنے لگے ہیں[57]

ایاز عباسی آزاد کشمیر میں شعر و ادب کی روایت میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ ان کا تعلق ضلع باغ آزاد کشمیر سے ہے۔ ایاز عباسی نے ہائیکو، نظم، منقبت، قطعہ، غزل اور نعت میں طبع آزمائی کی مگر نعت اور غزل ان کی خاص پہچان بنی۔ ان کا اولین شعری مجموعہ ''ظہور'' کے نام سے ۲۰۰۵ء میں شائع ہو کر ادبی حلقوں میں تحسین حاصل کر چکا ہے۔ جب کہ لمحہ تحریر تک مشق سخن جاری ہے۔ ایاز عباسی کی شاعری میں قریباً وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو ایک اچھے شاعر کے کلام کا وصف ہوتی ہیں۔ ان کا کلام حب رسول ﷺ اور حب وطن کے جذبات سے سرشار ہے۔ مثلاً:

؎ اس زمانے نے تو بس مار ہی ڈالا ہوتا

مصطفےٰ نے نہ اگر ہم کو سنبھالا ہوتا[58]

احمد عطاؔء اللہ آزاد کشمیر کے اہم شاعر ہیں۔ ان کا ابتدائی کلام احمد ندیم قاسمیؔ کے رسالے ''فنون'' میں چھپتا رہا۔ فنون کے ذریعے لاہور کے ادبی حلقوں میں متعارف ہوئے۔ احمد عطااللہؔ ریڈیو پاکستان لاہور سے بھی منسلک رہے۔ پاکستان ٹیلی ویژن لاہور سے ''گفتگو'' کے نام سے ادبی پروگرام کی میزبانی بھی کرتے رہے۔ احمد عطاؔء اللہ کا اولین شعری مجموعہ ''بھول جانا کسی کے بس میں نہیں''۱۹۹۸ء کو شائع ہوا۔ ان کا دوسرا شعری مجموعہ ''ہمیشہ''۲۰۱۱ء میں منظر عام پر آیا۔ ان کے کلام میں کشمیر، عشق و محبت، شہر، گاؤں، یاد، گلی مذہب وغیرہ اہم موضوعات ہیں۔ مثال کے طور پر بہ ذیل اشعار:

؎ فقط اس سے عبارت ہیں عطاؔ کشمیر کے منظر

کہ وہ گلِ رخ نہ ہو گا تو نظارہ بھی نہیں رہنا[59]

؎ برف زاروں سے کتنے ہی موسم سہانے گئے شہر کو
ہم تو ڈھلوان پر پانیوں کو عطاؔ روکتے رہ گئے[۶۰]

اسی طرح جاوید سحر اور احمد وقار ضلع نیلم کے نوجوان شاعر ہیں۔ اول الذکر کا شعری مجموعہ ''دستک'' سامنے آیا جب کہ مؤخر الذکر کا اپنا شعری مجموعہ تاحال شائع نہیں ہوا تاہم ضلع نیلم کے شعرا کا ایک انتخاب سامنے لا چکے ہیں۔ علاوہ ازیں شوزیب کاشر کا پہلا مجموعہ کلام ''میں نے پیار بیچ دیا''، دوسرا مجموعہ ''نوائے خضر'' جب کہ ایم یامین کا شعری مجموعہ ''دھوپ کا لباس''، پروفیسر اعجاز نعمانی کا مجموعہ کلام ''کہے بغیر'' اور ظہیر احمد مغل کا شعری مجموعہ ''میرا چاند'' بھی اس شعری روایت میں اہم اضافے ہیں۔

آزاد کشمیر کے مذکورہ بالا شعرا کے علاوہ بھی کئی قابل توجہ اور صاحب تصنیف شعرا موجود ہیں جو اس شعری روایت کو آگے بڑھانے میں اپنا زورِ قلم استعمال کر رہے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ وارث سرہندی، شیخ، علمی اردو لغت (متوسط)، علمی کتاب خانہ، لاہور، س ن، ص ۱۰۰۱

۲۔ عبدالحفیظ، ابوالفضل، مولانا، مصباح اللغات، مکتبہ برہان، نئی دہلی، ۱۹۹۰ء، ص ۱۴۷

۳۔ اردو لغت (تاریخی اصول پر)، جلد ہفت دہم، اردو لغت بورڈ، کراچی، دسمبر ۲۰۰۰ء، ص ۹۲۷

۴۔ مولوی سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ، جلد چہارم، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، اگست ۱۹۷۷ء، ص ۳۳

۵۔ خواجا محمد زکریا، ڈاکٹر، اردو نظم کے پچاس سال (مضمون) مشمولہ پاکستان میں اردو ادب کے پچاس سال، ڈاکٹر نوازش علی (مرتب)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۸۳

۶۔ ڈاکٹر انوار احمد، اردو میں مزاحمتی شاعری کا تنقیدی مطالعہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اردو)، اسلامیہ یونی ورسٹی، بہاول پور، ۲۰۰۵ء، ص ۱۸

۷۔ ایضاً، ص ۲۳

۸۔ مسرت صبوحی، پروفیسر، کشمیر میں مزاحمتی ادب، علی پرنٹر، میرپور، ۲۰۱۴ء، ص ۱۴

۹۔ سبینہ اویس اعوان، ڈاکٹر، پاکستانی اردو نظم میں مزاحمتی عناصر (مضمون)، مشمولہ الماس، شمارہ ۲۳، شاہ عبدالطیف یونی ورسٹی خیرپور، سندھ، ۲۰۲۰ء، ص ۱۷۷

۱۰۔ نعیم بیگ، مزاحمتی ادب اور اس کی تشریحات، www.deedbanmagazine.net، ۱۳/ جون ۲۰۲۲ء، 2.07pm

۱۱۔ ابرار احمد، مزاحمتی ادب (مضمون)، مشمولہ سہ ماہی ادبیات، اکادمی ادبیات، اسلام آباد، ۱۹۹۴ء، ص ۱۰۷۸

۱۲۔ راقم السطور (راناتوفیق صدیقی)، اقبال کے اردو کلام میں مزاحمتی عناصر (مضمون) مشمولہ روزنامہ صبح نو، مظفر آباد، ۲۷/ جون ۲۰۲۲ء

۱۳۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ٦

۱۴۔ رشید امجد، ڈاکٹر، پاکستانی ادب (رویے اور رجحانات)، پورب اکادمی، اسلام آباد، جنوری ۲۰۱۰ء، ص ۴۷

۱۵۔ اختر شیرانی، مقالات شیرانی، کتاب منزل، لاہور، ۱۹۴۸ء، ص ۱۰۴

۱٦۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، تنقیدی اصطلاحات (توضیحی لغت)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۲۴۴

۱۷۔ رشید امجد، ڈاکٹر، پاکستانی ادب (رویے اور رجحانات)، پورب اکادمی، اسلام آباد، جنوری ۲۰۱۰ء، ص ۴۷

۱۸۔ جعفر زٹلی، زٹلیات، نول کشور، لکھنو، ۱۹۴۱ء، ص ۲۳

۱۹۔ خلیق انجم، ڈاکٹر، مرزا محمد رفیع سوداؔ، انجمن ترقی اردو، علی گڑھ، ۱۹۶۶ء، ص ۳۶۲

۲۰۔ مرزا غالب، دیوان غالب، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۸ء، ص ۸۹

۲۱۔ میر تقی میرؔ، کلیاتِ میرؔ، نول کشور، لکھنو، ۱۹۴۱ء، ص ۸۰۶

۲۲۔ اظہر راہی (مرتب)، کلیات نظیرؔ، رام نرائن لال بنی مادھو، الٰہ آباد، ۱۹۷۶ء، ص ۶۷۵

۲۳۔ اکبرؔ الٰہ آبادی، کلیات اکبر الٰہ آبادی، بزم اکبر، کراچی، ۱۹۵۲ء، ص ۲۸

۲۴۔ ایضاً، ص ۳۴۳

۲۵۔ حسرتؔ موہانی، دیوان حسرتؔ، مطبع الناظر، لکھنو، ۱۹۱۸ء، ص ۳۶

۲۶۔ فانیؔ بدایونی، کلیات فانی، ناز پبلشنگ، ہاؤس، دہلی، س ن، ص ۳۵۳

۲۷۔ اقبالؔ، علامہ، کلیات اقبال، الفیصل ناشران و تاجران کتب، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۱۴۷

۲۸۔ جوشؔ ملیح آبادی، شعلہ و شبنم، مکتبہ جامعہ دہلی، نئی دہلی، ۱۹۳۶ء، ص ۳

۲۹۔ فیض احمد فیضؔ، نسخہ ہائے وفا، مکتبہ کاروان، لاہور، س ن، ص ۵۸

۳۰۔ ایضاً، ص ۲۰

۳۱۔ ن۔ م راشدؔ، کلیات راشد، کتابی دنیا، نئی دہلی، ۲۰۰۴ء، ص ۳۲۶

۳۲۔ حبیب جالبؔ، کلیات حبیب جالبؔ، طاہر سنز پبلشرز، لاہور، اپریل ۲۰۱۰ء، ص ۱۴۱۔ ۱۴۰

۳۳۔ احمد فرازؔ، غزل بہانہ کروں، کاک پرنٹر، دہلی، ۲۰۰۲ء، ص ۵۴

۳۴۔ احمد ندیم قاسمی، کرب نامہ (نظم)، مشمولہ مزاحمتی ادب اردو، ڈاکٹر رشید امجد (مرتب)، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۵ء، ص ۳۶۳

۳۵۔ عبدالعلیم صدیقی، نہاں خانہ دل، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۱۷۷

۳۶۔ اکرم طاہر، سقوط ڈھاکہ (نظم) مشمولہ سروش، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج، میرپور، ۲۰۱۱ء، ص ۲۹۱

۳۷۔ الطاف قریشی، شہر زندگی، نیلم پبلی کیشنز، مظفر آباد، ۱۹۹۵ء، ص ۱۰۷

۳۸۔ صابر آفاقی، ڈاکٹر، نئے موسموں کی بشارت، دستاویز مطبوعات، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ۲۰۱

۳۹۔ افتخار مغل، ڈاکٹر، لہو لہو کشمیر، اجالا پبلی کیشنز، مظفر آباد، ۱۹۹۱ء، ص ۶۲

۴۰۔ نذیر انجم، قرص سخن، ارشد بک سیلرز، میرپور، ۲۰۱۱ء، ص ۸۷

۴۱۔ رفیق بھٹی، پروفیسر، لہو نگر، پنجال پبلشرز، میر پور، ۱۹۹۷ء، ص۱۴۸
۴۲۔ بشیر احمد مغل، شہر دربدراں، کاشر پبلشرز، میر پور، ۱۹۹۳ء، ص۳۷
۴۳۔ محمد خان نشترؔ، لمحات نشتر، نیلم پبلی کیشنز، مظفر آباد، ۲۰۰۲ء، ص۴۳
۴۴۔ آمنہ بہار، چناروں کی آگ، علی پرنٹر، راول پنڈی، ۱۹۸۹ء، ص۳۷
۴۵۔ عابد محمود عابدؔ، اُداس ہنس لیں، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۲۱ء، ص۷۷
۴۶۔ ایضاً، ص۹۰
۴۷۔ ایضاً، ص۱۱
۴۸۔ مخلص وجدانی، صلیبیوں کا شہر، ادبیات، مظفر آباد، ۱۹۹۵ء، ص۱۷
۴۹۔ جاوید الحسن جاویدؔ، ابھی نظمیں ادھوری ہیں، رُمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، راول پنڈی، ۲۰۱۷ء، ص۱۵۹
۵۰۔ شہباز گردیزی، اجلی مٹّی (انتخاب)، نکس پبلشرز، میر پور، ۲۰۱۵ء، ص۲۶
۵۱۔ شفیق راجا، حرف حرف سمیٹوں، طلوع ادب پبلی کیشنز، باغ، ۲۰۰۳ء، ص۴۵
۵۲۔ واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، خزینہ علم و ادب، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص۴۵
۵۳۔ ایضاً، ص۶۸
۵۴۔ شہباز گردیزی، خواب کون دیکھے گا، طلوع ادب پبلی کیشنز، باغ، ۲۰۰۸ء ص۸۰
۵۵۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، (فلیپ) خاموشی کی کھڑکی سے، زکریا شاذ، زریون مطبوعات، فیصل آباد، ۲۰۱۳ء
۵۶۔ ایضاً، ص۱۴۷
۵۷۔ زکریا شاذؔ، غزل، مشمولہ رہبر (علمی و ادبی مجلہ)، آزاد کشمیر کالج ٹیچر ایسوسی ایشن، (ایکٹا) ۱۳۔۲۰۱۲ء، ص۱۳۷
۵۸۔ ایاز عباسی، ظہور، خزینہ علم و ادب، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص۲۱
۵۹۔ احمد عطاء اللہ، بھول جانا کسی کے بس میں نہیں، الرزاق پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص۱۸
۶۰۔ ایضاً، ص۵۰

باب دوم:

آزاد کشمیر کی اُردو نظم میں مزاحمتی عناصر

کسی بھی سماج میں جب جبر واستبداد اور دہشت کے ذریعے انسانی آزادی کو دبایا جاتا ہے تو اس کے نتیجے میں مزاحمتی ادب تخلیق ہوتا ہے۔ جو جبر کے خلاف آواز بلند کرتا ہے اور حق وانصاف اور آزادی کی خاطر اپنی جدوجہد کرتا ہے۔

اردو کے دیگر ادبا کی طرح آزاد کشمیر کے تخلیق کاروں کے ہاں بھی ظلم و جبر کے خلاف مزاحمت کی توانا آواز پائی جاتی ہے۔ گویا آزاد کشمیر کے ادب بالخصوص شاعری کا نمایاں فکری پہلو ہی اس کا مزاحمتی مزاج ہے۔ چوں کہ کشمیر کے عوام بھی اپنے حقوق، آزادی، خود مختاری اور بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں، اس لیے آزاد کشمیر کے ادب میں مزاحمتی عناصر کا ہونا فطری سی بات ہے۔

آزاد کشمیر کی معروضی سیاسی و سماجی حالات کی بنا پر یہاں کی شاعری کا معتدبہ حصہ مزاحمتی شاعری کے ذیل میں آتا ہے۔ اس علاقے کے اردو شعرانے ریاستی جبر، عالمی ظلم واستبداد، سماجی وعائلی فسطائیت، مطلق العنان انتظامیہ، سماجی رویے، آزادی و خود مختاری، ریاستی وسائل کی لوٹ مار اور طالع آزما سیاسی قوتوں جیسے مزاحمتی موضوعات کو شعوری طور پر اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔

اس خطے میں مزاحمتی شعری عناصر کو فروغ دینے کے لیے نذیر انجمؔ، احمد شمیم، پروفیسر رفیق بھٹی، مشتاق شاد، صابر آفاقی، اکرم طاہر اور افتخار مغل وغیرہ نے نمایاں کام کیا ہے۔ آزاد کشمیر کی بدلتی ہوئی سیاسی و سماجی قدروں اور ان قدروں کی تخلیقی سطح پر حمایت کے ضمن میں بھی یہاں کے شعرا کو سماجی و سیاسی سطح پر مزاحمت کا رویہ اپنانا پڑا۔

یہاں کی منظومات میں نذیر انجم کی نظمیں ''دلائی کیمپ''، ''پیام انقلاب'' اور ''نوید سحر'' رفیق بھٹی کی نظمیں ''شکوہ''، ''ہم چھین کے لیں گے آزادی''، ''اعلان آزادی''، اور ''منشور آزادی''، اسلم راجا کی نظموں میں ''عزم''، ''غیرت کی فتح'' اور ''انقلاب''، اسرار ایوب کی نظمیں ''حساب باقی ہے''، ''انتباہ''، ''خود اچھالیں گے آفتاب''، ''للکار'' اور ''نوجوانوں سے''، آمنہ بہار کی نظم ''جلتا ہوا پل''، ایم یامینؔ کی نظم ''اے روشنی کے شہیدِ اول'' اور مشتاق شادؔ کی معروف نظم ''اب ہے آزادی کا جذبہ آسمانوں سے بلند'' وغیرہ اپنے مضامین، ماحول، پس منظر اور مزاج کے لحاظ سے خاص مزاحمتی نوعیت کی ہیں۔

آزادی و خود مختاری

کشمیر کی آزادی و خود مختاری کا مسئلہ عرصہ دراز سے کھٹائی میں پڑا ہوا ہے۔ اس ضمن میں خود کشمیریوں کی آزادی کے لیے جدوجہد بھی خاص اہمیت رکھتی ہے۔ چوں کہ کشمیریوں کی ساری تاریخ جہد بقا اور مزاحمت سے عبارت ہے۔ اس لیے یہاں کے شعرا نے اپنے اپنے اعتبار سے اپنی دھرتی ماں کی آزادی و خود مختاری کے لیے جبر کے خلاف موثر آواز بلند کی ہے۔ مثلاً ریاست کے ایک حریت پسند شاعر نذیر انجمؔ نے آزادی و خود مختاری کی مخالف قوتوں کو للکارا ہے اور ریاستی و عالمی جبر کے اِداروں کو اِس ظلم کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔ انھوں نے شعوری طور پر مزاحمتی رویہ اپنایا ہے۔ نذیر انجمؔ کے کلام کے حوالے سے قدرت اللہ شہاب یہ ذیل رائے رکھتے ہیں:

> "نذیر انجمؔ کا نہایت اعلیٰ اور ارفع کلام قلب و روح کے احتظاظ کا باعث بنتا ہے۔ ان کے کلام کی سب سے نمایاں بات ظلم اور بے انصافی کے خلاف ان کا بہادرانہ مزاحمت کا رویہ ہے۔"[1]

نذیر انجمؔ ظلم و جبر کی زنجیروں کو توڑنے اور وادی غنچہ و گل کشمیر کو آزاد دیکھنے کے متمنی ہیں۔ نذیر انجمؔ نے کشمیر کے لیے جس دکھ، درد اور کرب کو محسوس کیا وہ ہمیں ان کے اشعار میں جابہ جا نظر آتا ہے۔ وہ کشمیر کی نہتی انسانیت پر ٹوٹنے والے مظالم کو بہت کرب اور تکلیف سے محسوس کرتے ہیں۔ ان مظالم کو دیکھ کر وہ اپنی ایک نظم "یاد آئے کشمیر بہت" میں پکار اٹھتے ہیں:

یاد آئے کشمیر بہت!

طوق و سلاسل کی جھنکاریں ہم سے مسلسل کہتی ہیں
سوچ کی سرحد پر پہرے ہیں ، سچ پہ ہے تعزیر بہت
کوئی دیس مناتا ہے جب دن اپنی آزادی کا
دل کا درد سلگ اُٹھتا ہے ، یاد آئے کشمیر بہت
جس گردن میں طوقِ غلامی وہ گردن ہر حال میں خم
جو قومیں آزاد ہیں انجمؔ وہ ہیں خوش تقدیر بہت[2]

ان اشعار سے بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کو اپنے دیس کی آزادی کا کس قدر ارمان ہے، وہ اپنے وطن میں آزادی کا سورج دیکھنا چاہتا ہے۔ کسی اور ملک کو آزادی مناتے دیکھتے ہیں تو ان کے دل میں اپنی غلامی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ نذیر انجم چوں کہ قوم پرست اور خود مختار کشمیر کے نظریے کے حامل شاعر ہیں، اس لیے مذکورہ نظم میں اپنے اسی نظریے کے مطابق خطہ کشمیر کو آزاد اور خود مختار دیکھنے کے متمنی دکھائی دیتے ہیں۔ اسی طرح کشمیر کے کرب کو نذیر انجمؔ نے دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا ہے، وہ اپنی نظم "پیام انقلاب" میں ظلم و جبر کا بھرپور انداز میں مقابلہ کرنے کی تلقین کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور وہ اعلان کرتے ہیں:

جلیں گے کب تلک سینے سے دوزخ میں ترے ارماں
دلِ مجروح کے ہر زخم کو اب تو زباں کر لے
مقابل جیشِ استبداد کے سینہ سپر ہو جا
یقین و جذبہ کامل کو شمشیر و سناں کر لے
جہاں میں زیر دستوں کے لیے مثلِ صبا ہو جا
زبردستوں کے دستِ ظلم پر خود کو گراں کر لے[۳]

ان اشعار سے شاعر کے دل میں اپنے دیس کے لیے جو دکھ ہے، اس کو بآسانی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ مزید براں وہ ظلم و استبداد کو دیکھ کر خاموش رہنا گوارا نہیں کرتا بل کہ اپنے کشمیری بھائیوں کو بھی عملی جد و جہد کی ترغیب دیتا ہے۔ نذیر انجم کی نظمیہ شاعری میں آزادیِ وطن اور حبِ کشمیر ایک قوت محرکہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

آزاد کشمیر کے یومِ تاسیس کے موقعے پر اہلِ کشمیر کے دل جس کرب سے گزرتے ہیں، اس حوالے سے نذیر انجم اپنی ایک نظم "صبح بہارِ آزادی" میں ظلمت کی سیاہ رات کا ذکر کرتے ہوئے کشمیریوں کی آزادی کی تڑپ کو بھرپور انداز میں دکھاتے ہیں۔ اس نظم کے آخری حصے میں وہ اعلان کرتے ہیں کہ ابھی صبح آزادی کی وہ منزل جس کا کئی دہائیوں سے انتظار تھا، وہ نہیں آئی۔ ابھی کشمیری قوم منتظر آزادی ہے۔ مزید براں آزادی کی صبح کو دیکھنے کے لیے کافی جد و جہد کی ضرورت ہے۔ ابھی تو نمودِ سحر غلامی اور جبر میں ڈوبی ہوئی ہے۔

اسیر ظلمتِ شب ہے ابھی نمودِ سحر
ترس رہے ہیں ابھی روشنی کو بام و در

پسِ نقاب سحر ہے فضائے ظلمت پوش
ہر ایک پیکرِ امید ہے تہی آغوش[۴]

مذکورہ بالا اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر آزادی کی کس قدر تڑپ اور آرزو سے مالا مال ہے۔ درحقیقت یہ تڑپ تمام کشمیری عوام کی تڑپ ہے۔ نذیر انجم نے اس نظم میں اہل کشمیر کے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ اہلِ کشمیر آزادی کی صبح کو دیکھنے کے لیے عرصہ دراز سے ترس رہے ہیں۔ یاد رہے اہل کشمیر یاسیت میں مبتلا نہیں بل کہ ان کی ہاں رجائیت اور امید کی کرن روشن ہے۔ وہ اس امید میں زندگی کی ساعتوں کو آگے بڑھا رہے ہیں کہ آزادی کی منزل قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی ہے۔ برسوں سے لپٹی غلامی کی زنجیر ایک روز ضرور کٹ جائے گی اور اہل کشمیر صبح آزادی کو دیکھ سکیں گے۔

نذیر انجمؔ تمام تر مجبوریوں اور معذوریوں کے باوجود اپنے وطن کی آزادی اور انسانیت کے درخشاں مستقبل پر یقین کامل رکھتے ہیں۔ وہ ایک باشعور مزاحمتی شاعر ہیں، تاریخ عالم کی جبریت اور واقعات پر ان کی گہری نظر ہے۔ اس لیے انھیں پختہ یقین ہے کہ مستقبل بہر صورت ماضی و حال سے بہتر ہوتا ہے۔ ان کے خیال میں انسان کا سفر خصوصاً آزادی اور حق کا یہ سفر زوال کے برعکس عروج کی جانب ہے۔ ان کے ہاں اقبال کی طرح ارتقا، تغیر اور حرکت کا تصور ملتا ہے۔ ان کی شاعری میں حرکت، گرمی اور توانائی ہے۔ ان کی منظومات ''نوید سحر''، ''ٹوٹے گی زنجیر''، ''پیام انقلاب'' اور ''صبح آزادی'' میں انسانیت کے شان دار مستقبل اور آزادیِ کشمیر پر اُن کے ایمان اور ایقان کا اظہار ہے۔ اس حوالے سے ان کے بہ ذیل نظمیہ اشعار ملاحظہ ہوں:

؎ خزاں منظر چمن رشکِ بہاراں ہونے والا ہے
وطن کا ذرہ ذرہ مہرِ تاباں ہونے والا ہے
جہاں ہر لحظہ رقصاں ہیں شرارے آتشِ غم کے
وہ صحرائے تمنا شبنمستان ہونے والا ہے[۵]

اسی طرح ''لہو لہو کشمیر'' کے خالق افتخار مغل کی شاعری میں بھی مزاحمتی عناصر بہ طور خاص دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی تحریک آزادی کشمیر کے لیے تحریر کردہ نظموں کا مجموعہ ''لہو لہو کشمیر'' ہے۔ افتخار مغل کشمیر کے حساس ترین قلم کار ہیں جن کے ہاں اپنے وطن کی غلامی کا احساس بہت قوی ہے۔ ان کی شاعری میں جنگ کا

سماں نظر آتا ہے۔ افتخار مغل کی شاعری آزادی کشمیر کی علم بردار ہے۔ وہ ظلم و جارحیت کے خلاف ڈٹ جاتے ہیں۔ مثلاً ان کی ایک نظم ''لہو مانگتی ہے چناروں کی دھرتی'' کا ایک بند ملاحظہ ہو:

؎ اُٹھو! اس کو خونِ جگر سے سجائیں
اُٹھو! ظلمتِ شب میں نشیمن جلائیں
صدا میں صدا، خون میں خون ملائیں
اٹھو! جبر سے آج پنجہ لڑائیں
یہ اپنی زمین اپنے پیاروں کی دھرتی
لہو مانگتی ہے چناروں کی دھرتی[۶]

ڈاکٹر افتخار مغل آزاد کشمیر کے ایسے شاعر ہیں جن کے رگ و پے میں وطن کی محبت رچی بسی ہے۔ ان کا ہر شعر اس بات کی غمازی کرتا ہوا نظر آتا ہے کہ انھوں نے وادی کشمیر کے جلتے مناظر خود سوختہ ہو کر دکھائے ہیں۔ انھوں نے سری نگر میں کرفیو کی شدت اور جلتے گھروں کی حدت روح کی گہرائیوں تک محسوس کی ہے۔ ان کی انگلیوں کی پوروں میں کرب کی یہ ساری آگ سمٹ آئی ہے۔ مزید براں ان کی ایک اور نظم ''کشمیر توجہ چاہتا ہے'' میں بھرپور مزاحمتی انداز جھلکتا ہے۔ اس نظم کے دو بند خاصے کی چیز ہیں۔

کشمیر توجہ چاہتا ہے

دنیا کے مہذب انسانو! کشمیر توجہ چاہتا ہے
کشمیر کے شہر سلگتے ہیں کشمیر کی گلیاں جلتی ہیں
کشمیر کے درد کو پہچانو! کشمیر توجہ چاہتا ہے
دنیا کے مہذب انسانو! کشمیر توجہ چاہتا ہے

اس عہد میں انساں کے ہاتھوں انسان کی اتنی توہینیں
انسان کی آزادی کے پیمان کی اتنی توہینیں
انسان کے خون کی ارزانی، دیکھو تو سہی، سوچو تو سہی
خون سستا ہے، مہنگا پانی، دیکھو تو سہی، سوچو تو سہی
اس دیس میں ہر صبح، ہر شب کو دوزخ کی ہوائیں چلتی ہیں

کشمیر کے شہر سلگتے ہیں ، کشمیر کی گلیاں جلتی ہیں
انسان کے درد کو پہچانو، کشمیر توجہ چاہتا ہے
دنیا کے مہذب انسانو! کشمیر توجہ چاہتا ہے
اس عہد میں بھی اس دھرتی پر غرور کی شاہی چلتی ہے
ظالم کی عدالت لگتی ہے ، قاتل کی گواہی چلتی ہے
ہر ایک زباں پر پابندی ، ہر ایک نظر پر پہرہ ہے
ہر نالہ ہے زنجیر وہاں ، ہر ایک فُغاں پر پہرہ ہے
ہر روز وہاں پر ظلمت کی تعزیریں آج بدلتی ہیں
اس دھرتی کے غم جانو، کشمیر توجہ چاہتا ہے
دنیا کے مہذب انسانو! کشمیر توجہ چاہتا ہے[۲]

افتخار مغل وادیِ کشمیر کے پُرعزم اور باہمت حریت پسند شاعر ہیں۔ ان کی نظمیں مزاحمتی انداز و جذبات سے بھرپور ہیں۔ ''لہو لہو کشمیر'' میں ان کی آزادی کے پس منظر میں تخلیق ہونے والی نظمیں آزادی کشمیر کا بہترین پیام بر ہیں۔ کشمیر کے مسئلے پر مقتدر قوتوں کی کارستانیوں کو ہدف تنقید بناتے ہیں اور پکار اٹھتے ہیں کہ ''ظالم کی عدالت لگتی ہے، قاتل کی گواہی چلتی ہے''۔ تاریخ کشمیر اس بات کی گواہ ہے کہ کچھ اسی طرح تاریخ میں ہوتا آیا ہے۔ڈاکٹر افتخار مغل کی شاعری میں نہ صرف مظالم کی تصویر پیش کی گئی ہے بل کہ ان مظالم کے ذمہ داروں کو بھی آڑے ہاتھوں لیا گیا ہے۔المختصر آزادی کشمیر کی منزل کی جانب چلنے والے قافلوں میں افتخار مغل کی صدا آگے آگے ہے۔

ڈاکٹر صابر آفاقی نے کشمیر کی آزادی کے حوالے سے متعدد نظمیں لکھیں جو مختلف رسائل میں بھی طبع ہوتی رہیں اور ان کے شعری مجموعوں کا بھی حصہ ہیں۔چوں کہ صابر آفاقی کا وطن خطہ کشمیر ہے اس لیے اہلِ کشمیر پر ہونے والے مظالم، جبر و استبداد کو دیکھ کر خاموش نہیں رہ سکتے۔ اس سلسلے میں انھوں نے اپنی نظمیہ شاعری کے ذریعے اس ظلم و تشدد کے خلاف آواز بلند کی۔اس حوالے سے ان کی نظمیں جن میں ''شہدائے جموں کے حضور میں''، ''مادر کشمیر'' اور ''خاکِ وطن سے'' بہ طور خاص قابل ذکر ہیں۔ان کی نظم ''خاک وطن سے'' کشمیر کی آزادی کی تڑپ اور اپنے وطن سے گہری انسیت کی آئینہ دار ہے۔اس کے علاوہ اُن

کی نظم ''مادر کشمیر'' میں آزادی کشمیر کی نوید سنائی گئی ہے۔اِن کے نزدیک کشمیریوں پر ڈھائے جانے والے مظالم،ان کے جذبہ آزادی کو سرد اور کچل نہیں سکتے۔ان کی نظم سے چند اشعار بہ طور مثال ملاحظہ ہو:

ے کچھ اور دہکی ہے آتش ترے چناروں کی
کچھ اور تیرے سپوتوں کا بڑھ گیا ہے جنوں
افق پہ نجم سحر جگ مگانے والا ہے
رہے گا ٹوٹ کے آخر سیہ شبی کا فسوں[۸]

اسی طرح ڈاکٹر آمنہ بہار کی نظم ''جلتا ہے کشمیر'' اور ''جلتا ہوا پل'' نظمیں کشمیر کی تحریک آزادی کے پس منظر میں تخلیق کی گئی ہیں۔یہ ایسی نظمیں ہیں جن میں کشمیریوں پر ہونے والے ظلم و جبر کو دکھایا گیا ہے۔مذکورہ دونوں نظمیں آمنہ بہار کے مزاحمتی رویے کی آئینہ دار ہیں۔ان نظموں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اہل کشمیر پر ہونے والے مظالم،ان کے قلوب و اذہان سے آزادی کی تمنا و آرزو کو کسی طور کم یا مٹا یا نہیں سکتے۔علاوہ ازیں آمنہ بہار کی نظمیں ''اے صبح کے تارے سن''، ''مرے وطن کے عظیم بیٹو''، ''خورشید ملت'' وغیرہ خاص مزاحمتی رنگ لیے ہوئے ہیں۔مثلاً ان کی ایک نظم سے چند اشعار:

جنگل جنگل صحرا جیسا
شہزادے دل گیر
سبز رُتوں کو روشن قریہ
جیسے قبرستان
ہر گوشہ ویران
بادل بادل آگ لگی ہے
جلتا ہے کشمیر[۹]

ڈاکٹر آمنہ بہار کے نزدیک کشمیریوں کے مقدر کا ستارہ تبدیل ہونے والا ہے۔اہل کشمیر کا غلامی اور ظلم بھرا یہ سفر اختتام پذیر ہے۔وہ اپنی سرزمین کو آزادی کے قریب دیکھ رہی ہیں۔بہ ذیل اشعار میں آمنہ بہار پر امید دکھائی دیتی ہیں کہ بہت جلد اہل کشمیر کو فتح ملنے والی ہے۔

اس وادیِ شاداب کا اِک حصہ ہے محکوم
عوام کے ہاتھوں میں ہے زنجیر غلامی
سر سبز سے اَشجار سُلگتے ہیں شَب و روز
ہو گی کوئی ساعت تو سحابوں کی پیامی
آزادیِ کشمیر کا ہر دل کو یقین ہے
اور ملتِ اسلام کی اب فتح مبیں ہے[10]

اسی طرح آزاد کشمیر کے ایک اور اہم شاعر مشتاق شادؔ کی شاعری میں کشمیر کے ضمن میں گہرے دکھ اور کرب کا بے ساختہ اظہار ہوتا ہے۔ان کی کشمیر کے تناظر میں لکھی جانے والی اکثر نظموں میں جذبات اپنی برہنہ حالت میں موجزن دکھائی دیتے ہیں۔شاعر نے آزادی کشمیر کی خاطر جموں وکشمیر میں ہونے والے ظلم وجبر کو جس شدت سے محسوس کیا ہے، اس کے اظہار میں کسی نقاب یا تمثیل کا سہارا نہیں لیا بل کہ اس کرب کو مزاحمتی انداز میں پیش کر دیا ہے۔ ان کی منظومات میں آزادی کشمیر کی خاطر کٹ مرنے کا عزم پوشیدہ ہے۔اس تناظر میں ان کی منظومات میں ''ڈل کے پانیوں میں''[11]، ''کریں گے بہارِ خاک وخوں آراستہ''[12] اور ''اب ہے آزادی کا جذبہ آسمانوں سے بلند''[13] زیادہ اہم ہیں۔

پروفیسر نذیر انجمؔ کی نظمیہ شاعری میں بالخصوص جو انھوں نے کشمیر کے تناظر میں منظومات تخلیق کی ہیں، ان میں آزادی کی نوید بڑی صاف اور واضح سنائی دیتی ہے۔اس حوالے سے اُن کی نظم ''کشمیر'' سے یہ ذیل مصرعے ملاحظہ ہوں۔

؎ لیکن اس وقت کو بدلنا ہے
کب دبی ہے جواں لہو کی پکار
دے رہی ہے نویدِ آزادی
یہ سلاسل کی پے بہ پے جھنکار[14]

آزاد کشمیر کی نظمیہ شاعری کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ کشمیر میں مزاحمت اور مر مٹنے کا جذبہ کیسے پیدا ہوا یعنی کس طرح ایک طاغوتی قوت کے ظلم وستم نے کشمیریوں کے دل میں آزادی کا پاکیزہ جذبہ پیدا کیا۔ مزید براں یہ کشمیری سر اٹھا کر چلنے اور آزادی کے لیے نقدِ جاں تک پیش کرنے کے قابل ہو گئے۔

ریاستی جبر اور طالع آزما سیاسی قوتیں

پاکستان کے زیر انتظام آزاد ریاست جموں وکشمیر کے سیاسی و انتظامی احوال بھی زیادہ تر غیر مستحکم رہے ہیں۔ یہاں کی سیاسی انتظامیہ اور حکومتوں کی پالیسیوں میں تسلسل کا فقدان رہا ہے۔ چناں چہ پاکستان کی سیاسی تاریخ میں جب بھی طالع آزما حکم رانوں، مطلق العنان جانشینوں، آمروں اور شہریوں کی اندرونی خود مختاری سلب کرنے والے ارباب اختیار کو اقتدار ملا، اس کے نتیجے میں جس قسم کا شعری رد عمل پاکستان کے شعرا کے ہاں پیدا ہوا ویسا ہی آزاد کشمیر کے شعری ادب میں بھی دیکھنے کو ملا۔ پاکستان کی تینوں فوجی آمروں کے ادوار میں آزاد کشمیر میں بھی آمرانہ اور مطلق العنان حکومتی انتظامیہ منتخب کی گئی۔ حالاں کہ اس خطے کے معروضی سیاسی حالات پاکستان کی نسبت یکسر مختلف تھے۔ یہاں کے سیاسی اور جمہوری نظام کو کسی بھی قسم کے تعطل کا شکار بنانے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

اس کے باوجود پاکستان کی مطلق العنان حکومتی مشینری نے اس آمرانہ ادوار کے دوران میں یہاں کے سیاسی نظام اور جمہوری عمل کو نہ صرف متاثر کیا بل کہ اس ریاست کے سیاسی عمل اور جمہوری اقدار کو سبوتاژ کرتے ہوئے اپنے اپنے سیاسی حلیفوں کو مسلط کرنے کی پالیسی اختیار کی۔ اس کے رد عمل میں آزاد کشمیر کے شعرا کے ہاں ایک زبردست مزاحمتی رد عمل دیکھنے کو ملتا ہے۔ چوں کہ ادیب اور شعرا معاشرے کے حساس طبع کے مالک افراد ہوتے ہیں۔ اس لیے ان ادبا کی تحریروں میں اس سوچ اور عمل کے خلاف رد عمل سامنے آنا فطری بات تھی کہ پاکستان کی حکومتیں آزاد خطے کو اپنی نو آبادی سمجھتی ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ احساس بھی پیدا ہوا کہ پاکستان میں حکومتی تبدیلی سے یہاں کے سیاسی اور جمہوری حکومتوں کو من پسند حکومت سے کیوں مبدل کیا جاتا ہے؟ تاریخ گواہ ہے کہ یہاں کے معروضی سیاسی حالات اور اس علاقے کی حساس صورت حال کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بغیر کسی قانونی و آئینی جواز کے اپنے نام نہاد سیاسی حمایتیوں کو اقتدار کی ڈوری تھما دی جاتی ہے۔ آزاد کشمیر کی سیاسی تاریخ میں اس کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ ڈاکٹر افتخار مغل اس حوالے سے اپنی کتاب میں یوں رقم طراز ہیں:

> ”۱۹۷۱ء میں آزاد کشمیر میں سردار عبدالقیوم خان کی حکومت کو غیر آئینی اور غیر اخلاقی طریقے سے معزول کر کے خطے میں بدترین سیاسی دھاندلی کے ذریعے پیپلز پارٹی کی حکومت کا مسلط کرنا اور ۱۹۷۷ء میں پیپلز پارٹی کی حکومت کو معزول کر کے

ایک بریگیڈیئر کی زیرِ نگرانی فوجی انتظامیہ مقرر کر دیا جانا اس امر کی دو اہم مثالیں ہیں۔"[۱۵]

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ آزاد جموں و کشمیر میں ہمیشہ سے پاکستانی حکومتوں کی حمایت یافتہ حکومت قائم دائم رہی ہے۔ہنوز یہی تسلسل بر قرار نظر آتا ہے۔آزاد کشمیر کے مزاحمتی رجحان رکھنے والے شعرا کے ہاں اس مطلق العنان انتظامیہ اور ریاستی جبر کے خلاف باقاعدہ نظموں کی صورت میں مزاحمتی رویہ موجزن ہے۔اس حوالے سے نذیر انجم کی نظم " دلائی کیمپ" اور رفیق بھٹی کی معروف نظم "شکوہ" قابل توجہ ہیں۔یہ دونوں نظمیں ایک خاص سیاسی پس منظر رکھتی ہیں۔نذیر انجم کی مذکورہ نظم پاکستان پیپلز پارٹی کے جمہوری نازی ازم کے بدنام زمانہ عقوبت خانے "دلائی کیمپ" کے حوالے سے اہم ہے۔جو آزاد کشمیر کے دارالحکومت مظفر آباد سے چند کلو میٹر کی مسافت پر دلائی کے مقام پر واقع ہے۔اس عقوبت خانے میں آزاد کشمیر کے کئی سیاسی مخالفین اور آزادی پسندوں کو نہ صرف پابندِ سلاسل کیا گیا بل کہ ان کو ظلم و تشدد اور ٹارچر کا بھی نشانہ بنایا گیا۔یاد رہے اُس وقت یہ حکومت پاکستانی طالع آزما سیاسی قوتوں کی جانب سے غیر آئینی اور غیر اخلاقی طور پر بلا جواز مسلط کی گئی تھی ۔اس طرح کے اقدام ریاستی اور سیاسی جبر کی واضح مثالیں ہیں۔اس غیر اخلاقی اور غیر قانونی اقدام کے خلاف یہاں کے شعرا نے متاثر کن آواز بلند کی۔مذکورہ بالا نظم "دلائی کیمپ" اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

؎ یہ وہ زنداں ہے جہاں سچ کے پرستاروں کو
منزلِ شوق کے بے باک طلب گاروں کو
کلفتیں سہنے پہ مجبور کیا جاتا ہے
یہ وہ زنداں ہے جہاں قوم کے غم خواروں کو
آمرِ وقت کی تائید و حمایت کا سبق
طوق و زنجیر کی صورت میں دیا جاتا ہے[۱۶]

اس نظم کے توسط سے آمرانہ مزاج کے حامل حکم ران طبقے اور مطلق العنان انتظامیہ کے ظالمانہ رویے اور سیاسی بنیاد پر ڈھائے جانے والے مظالم و جبر کو عیاں کیا گیا ہے۔بے گناہ اور بے جرم انسانوں کو پابند سلاسل کر کے اس کیمپ میں محصور کر رکھا ہے۔طالع آزما حکمران اپنی ہی رعایا کو اپنی نااہلی اور ناکام پالیسیوں

کے خلاف آواز بلند کرنے پر سزا سے دوچار کر رہے ہیں۔ اس نظم کے ذریعے سے نذیر انجمؔ نے اس بات کی نقاب کشائی کی ہے کہ آج بھی حضرت انسان کا ضمیر نیند کے عالم میں ہے۔ صاحب اختیار آدمیت اب بھی ماضی کی لکیروں میں پیوست ہے۔ سطوت شاہی کی بقا کی خاطر اپنی رعایا کو مٹا دیا جاتا ہے۔

اس ظلم و جبر اور قید و بند کی صعوبتوں کے باوجود، ان حق پرستوں کے پایہ استقلال میں ذرا سی بھی لغزش نہیں آئی۔ یہ حق پرست اور آزادی پسند برابر باطل کے سامنے حق پہ ڈٹے رہے۔ جبر و استبداد کی تکالیف برداشت کرتے رہے۔ نظم ''دولائی کیمپ'' کے آخری بند میں نذیر انجمؔ ان طالع آزما حکم رانوں کو للکارتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے دولائی کے مغرور خداؤ! سن لو، ایک دن یہ پاؤں کی بوجھل زنجیر ٹوٹ کر رہے گی۔ ایک روز جسم پر جبر اور آزادی اظہار رائے پر لگنے والی قدغنوں سمیت یہ تعزیریں ختم ہو کر رہیں گی۔ ان محکوموں کو نئی صبح مل کر رہے گی۔ نذیر انجمؔ کی ظالم حکم رانوں کے لیے اس للکار کو بہ ذیل اشعار میں دیکھا جا سکتا ہے۔

ارضِ کشمیر کی محکوم فضاؤ! سن لو
خلد کشمیر کی مغموم ہواؤ! سن لو
اک نئے دور کے خالق ہیں یہ بے جرم اسیر
تم بھی دولائی کے مغرور خداؤ! سن لو
اک نئی صبح انھیں مل کے رہے گی آخر
ٹوٹ جائے گی ہر اک پاؤں کی بوجھل زنجیر
جسم پر جبر، نہ گفتار پہ ہو گی تعزیر[۱۷]

آزاد کشمیر کے شعرا نے اپنی قومی تاریخ کے سارے تناظر میں ریاست کے سیاسی معاملات میں گہری دل چسپی دکھائی ہے۔ ریاستی یا سیاسی معاملات کے علاوہ پاکستان کے سیاسی احوال بھی یہاں کے شعرا کی توجہ کا مرکز رہے۔ کیوں کہ پاکستانی سیاست کے اثرات بالواسطہ یا بلاواسطہ آزاد کشمیر کے آئینی، سیاسی اور انتظامی ڈھانچے کو متاثر کرتے چلے آئے ہیں۔ ان حالات میں آزاد کشمیر کے شعرا نے قومی اور سیاسی تاریخ کے ہر دور میں رد عمل کا شعری اظہار کرنے میں کبھی بھی عار محسوس نہیں کی۔ ان شعرا نے جمہوری اور آمریت کے زیر اثر ہر دو قسم کے سیاسی حالات میں ظلم و جبر کے خلاف اپنا یہ رد عمل جاری رکھا۔

قوم پرست شعرا نے سیاسی معاملات میں اپنے اظہار کو بہت نمایاں اور واشگاف طور پر بیان کیا ہے۔ ان شعرا میں نذیر انجم، رفیق بھٹی، ڈاکٹر افتخار مغل، نثار ہمدانی، اور توقیر گیلانی کے نام نمایاں ہیں۔ افتخار مغل کی نظم "ہوا قائل نہیں ہوتی"[18] پروفیسر رفیق بھٹی کی نظم "شکوہ"[19] نذیر انجم کی نظم "دلائی کیمپ"[20] اور توقیر گیلانی کی نظم "عشاق"[21] بہ طور خاص سیاسی اور ریاستی جبر کے پس منظر میں تخلیق کی گئیں۔

اسی طرح مشتاق شادؔ کشمیر میں ہونے والے ظلم و ستم کو دیکھ کر خونی منظر کے جس کرب اور درد کو اپنی نظموں میں بیان کرتے ہیں، اس سے بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے کہ کشمیر میں خون کی کس قدر ارزانی ہے اور یہاں کس طرح خون سے ہولی کھیلی جا رہی ہے۔ ان کے مطابق جھیل ڈل کے پانی میں بھی اس خون کی آمیزش ہے۔ کشمیر کی خاک کا چپہ چپہ خونِ شہیداں سے سُرخ ہے۔ کشمیر میں بھارت کی قابض افواج ریاستی باشندوں پر گولیوں کی بارش کر رہی ہے، جس سے ہر طرف خون بہنے کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ بھارت کے اس ریاستی جبر کو مشتاق شادؔ کے بہ ذیل چنیدہ مصرعوں میں بہ خوبی دیکھا جا سکتا ہے:

؎ گولیاں چلتی ہیں بازاروں میں اور گلیوں میں خون
اب ہے خوش بو کی جگہ پھولوں اور کلیوں میں خون
چپہ چپہ خاک کا خونِ شہیداں سے ہے سرخ
ہر قدم پر سینکڑوں لاشیں گریں کشمیر میں
ہند کے کافر مسلمانوں پہ چنگیزی کریں
جھیل ڈل کے پانیوں میں خون آمیزی کریں[22]

مشتاق شادؔ کی شاعری میں ریاستی جبر کی گھن گرج بڑی تفصیل سے موجزن ہے۔ کشمیری گلیوں کوچوں میں موت رقص کرتی ہے، ان کی فوجی بارکوں میں معصوم کشمیری عورتوں کی اجتماعی آبروریزی کرنا دستور بن چکا ہے۔ بہن کے سامنے بھائی کو شہید کر دیا جاتا ہے اور اسی طرح بھائی کے سامنے بہن کی عزت تار تار کر دی جاتی ہے۔ کشمیر سفاکیت اور شیطانیت کا ایک عجیب منظر پیش کر رہا ہے۔ کشمیریوں پر یہ تمام تر مظالم اور ریاستی جبر صرف اور صرف اپنا پیدائشی حق، حقِ خود ارادیت مانگنے کی پاداش میں روا رکھا جا رہا ہے۔

ریاستی جبر کے سلسلے میں وادی کشمیر میں موت کی ارزانی کو مشتاق شادؔ نے شعری قالب میں خوبی کے ساتھ ڈھالا ہے۔ شاعر اس موت کے بیان کو مختلف شعری رنگوں کے توسط سے بیان کرتا ہے۔ اس کی شاعری

سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس وادی کے ذرے ذرے سے ارزانیِ خون کی داستان سنائی دے رہی ہے۔ مشتاق شادؔ کی شاعری سے خطہ کشمیر کے دامن میں موت کی ارزانی بہ ذیل اشعار میں دیکھی جاسکتی ہے:

؎ اُگ رہی ہے سب گھروں کے صحن میں لاشوں کی فصل
موت کتنی مہرباں ہے وادی کشمیر میں[۲۳]

؎ ارزاں ہوا پھر خون، شہیدوں کے وطن میں
پھر وادی کشمیر لہو رنگ ہوئی ہے[۲۴]

؎ یوں خون شہیدوں کا ہے ارزاں سر بازار
مقتول اکیلا ہے تو قاتل ہیں کئی ایک[۲۵]

نوے کی دہائی میں تحریک آزادی کشمیر کی تاریخ میں ایک نیا موڑ آیا۔ کشمیریوں نے مسلح جدوجہد شروع کی۔ پاکستان اور بھارت کی طرف سے بھی ملکی سطح پر کشمیر کے محاذ پر فوجی جھڑپیں شدت اختیار کر گئیں۔ کشمیر میدان جنگ بن گیا، اس وقت کشمیریوں کے دلوں میں جذبہ آزادی پہلے کی نسبت کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔ کشمیری آزادی کی خاطر جذبہ شہادت سے سرشار نظر آتے ہیں۔ کفر سے بھرپور طاقت کے ساتھ مقابلہ کرنے کا عزم لیے، آزادی کی جہدِ مسلسل میں مستغرق دکھائی دیتے ہیں۔

کشمیری حریت پسند اس بات کا سرعام اعلان کرتے ہیں کہ اپنی سرزمین پر ظلم، ریاستی جبر اور فساد کے خاتمے تک جنگ جاری رہے گی، کسی بھی قیمت پر آزادی کی شمع کو گل ہونے نہیں دیں گے۔ کشمیری اس بات کا مستحکم عزم رکھتے ہیں کہ ایک دن غلامی کی زنجیریں کٹ جائیں گی۔ مشتاق شادؔ کے بہ ذیل مصرعے کشمیریوں کے اس جذبے کی بھرپور غمازی کرتے ہیں:

؎ اب قدم اپنے کسی قیمت پہ رک سکتے نہیں
کٹ کے گر سکتے ہیں سر شانوں سے جھک سکتے نہیں
یہ ہوا کیسے کسی طوفان سے ٹکرائے گی
جنگ توپوں سے نہیں، جذبوں سے جیتی جائے گی[۲۶]

شادؔ نے اپنی اس نظم میں کشمیریوں کے سچے جذبے کی عکاسی کی ہے، کشمیریوں کے نزدیک آزادی کشمیر سے بڑھ کر کچھ بھی پیارا نہیں۔ یہی وجہ ہے شاعر یہاں بھارتی غاصبوں کو بے باک انداز میں للکارتے ہیں۔ اس ضمن میں مشتاق شادؔ کی للکار ملاحظہ ہو:

؎ تم ہمارے کھیت اور کھلیان سب خالی کرو
یہ ہماری سر زمیں ہے اس کو اب خالی کرو[۲۷]

نذیر انجمؔ کی طرح مشتاق شاد بھی دشمنوں اور غاصبوں کو للکارتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ اپنی شاعری میں بھارتی سفاک افواج اور کشمیر پہ قابض مقتدر طاقتوں کو شیطان اور عیار قرار دیتے ہیں۔ شادؔ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اس خطے میں بھارتی کے ناپاک عزائم ایک دن ضرور خاک کے سپرد ہو جائیں گے۔ آزادی کی اس لہر میں دشمن کے عزائم خس و خاشاک کی مانند ہیں۔ شاعر کو یقین ہے کہ کشمیر کی مِٹّی غاصبوں اور سفاکوں سے پاک ہو کر رہے گی۔ گویا شادؔ بہ ذیل شعر میں دشمن سے مخاطب ہے:

؎ شیطان ہے ، عیار ہے ، چالاک ہے
اس لہر کی زد میں خس و خاشاک ہے دشمن[۲۸]

کشمیری وادی کشمیر کے محاذ پر شہادت کو بقائے حریت گردانتے ہیں۔ ان کے حوصلے آسمان کی طرح بلند ہیں، یہ کسی طور بھی پست نہیں ہو سکتے۔ اہلِ کشمیر آزادی کی راہ میں مر کر بھی اپنی خاک کو نہ چھوڑنے کا عزم لیے ہوئے ہیں۔ مزاحمت کی اس تحریک میں کشمیریوں کے جذبات کو شاعر نے شعر کے قرینے میں یوں سمویا ہے:

؎ جاں ہتھیلی پر، کفن سر پر لیے آئے ہیں
اب جفا کیسی، تمھارا ظلم کیا ، آزار کیا[۲۹]

مشتاق شادؔ کی دیگر مزاحمتی منظومات میں ''مرے لہو سے میری خاک سرخ ہے''، ''کشمیر مجھے جان سے پیارا''، ''جہاں خاموش رہتا ہے''، ''زخموں کی سرگوشی''، ''اب ہے آزادی کا جذبہ آسمانوں سے بلند''، ''یہ سلسلہ دار ورسن ٹوٹ چلا''، ''قاتل ہیں کئی ایک''، ''جلتا ہے کشمیر''، ''لہو کے ماہتاب'' اور ''لہو کی آگ''[۳۰] قابلِ ذکر ہیں۔ شادؔ کی مذکورہ نظموں میں مزاحمت کی لے مدھم ہے، تاہم یہ منظومات آزادی کی بھرپور نوید سنا رہی ہیں۔ نظم ''سب دروازے بہرے ہیں'' میں عالمی اداروں کی خاموشی کو ہدف تنقید بنایا گیا ہے، اس کے ذریعے عالمی امن اور انصاف کے اداروں کو للکارا ہے۔

عالمی ظلم و استبداد

مسئلہ کشمیر گزشتہ کئی دہائیوں سے حل طلب چلا آرہا ہے۔اسی طرح عالمی سطح پر فلسطین، چیچنیا، بوسنیا وغیرہ میں ظلم و تشدد جاری ہے۔ تنازعہ کشمیر کے سلسلے میں لمحہ موجود تک کشمیری مسلمانوں نے ہزاروں کی تعداد میں اپنا خون قربان کیا ہے۔ لیکن تاحال اس کا کوئی باضابطہ اور پر امن حل نہیں نکل سکا۔اس ضمن میں کئی خونی معرکے اس سرزمین پر سرزد ہوئے۔پاکستان اور بھارت کے درمیان اسی مسئلے کی بنا پر کئی جنگیں ہو چکی ہیں۔اس خطے میں بھارتی مظالم کا ایک نہ تھمتا ہوا طوفان برپا ہے۔

بھارت خطہ جموں و کشمیر میں بدترین تشدد، ناانصافی اور بنیادی انسانی حقوق کی کھلم کھلا پامالی کرتا آرہا ہے۔اس حوالے سے عالمی انسانی حقوق کی تنظیمیں اور عالمی امن کے دعوے دار اقوام متحدہ جیسے ادارے بھی محض بیان بازی اور مذمت کی حد تک کردار ادا کرتے دکھائی دے رہے ہیں۔ اس مسئلے کا حل نہ ہونے کا سب سے بڑا ذمے دار اقوام متحدہ ہے۔چوں کہ یہ عالمی ادارہ عالمی مسائل، عالمی تضادات اور عالمی تنازعات کو مختلف ممالک کے مابین افہام و تفہیم کے تحت ختم کرنے کی غرض سے تشکیل دیا گیا تھا۔اس کا مقصد عالمی سطح پر امن کا قیام تھا۔ مگر یہ ادارہ اپنے ہی فیصلوں کی پاس داری نہیں کر سکا۔

جن اعلیٰ انسانی اصولوں کی سربلندی کی خاطر اقوام متحدہ کا عالمی ادارہ وجود میں لایا گیا تھا، خود اقوام متحدہ کے ہاتھوں ان اصولوں کی پامالی اس ادارے کی فطرتِ ثانی بن چکی ہے۔ فلسطین اور کشمیر سے بین الاقوامی تنازعات کے سلسلے میں اقوام متحدہ کا غاصبوں کے حق میں جھکاؤ بہ خوبی دکھائی دیتا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر ظالموں کی ہم نوائی اور دست گیری کا چلن اردو شاعری کے لیے سوہانِ روح ہے۔ کشمیر کا تنازعہ نصف صدی سے حل طلب ہے مگر سلامتی کونسل کی قراردادیں خود اپنے خالقوں کی بے اعتنائی اور انصاف دشمنی کی نوحہ گر ہیں۔ جہاں انصاف پسندی اور امن دوستی کے تقاضے عالمی مقتدر طاقتوں کے سامراجی عزائم سے متصادم ہوں وہاں اقوام متحدہ کی جانب دارانہ بے عملی مجرمانہ حدود کو چھونے لگتی ہے۔اس غیر عادلانہ طرز بے عملی کی روشن مثالیں مسئلہ کشمیر اور فلسطین ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اردو ادب میں اس طرز بے عملی کے خلاف بھرپور ردعمل دیکھنے کو ملتا ہے۔اس حوالے فتح محمد ملک ان الفاظ میں صراحت کرتے ہیں:

> "کشمیر کا تنازعہ اقوام متحدہ کے بڑوں کی مصلحت پسندی اور ظلمت دوستی کے باعث ایک رستا ہوا ناسور بن چکا ہے۔ گزشتہ نصف صدی سے کشمیریوں کی بنیادی انسانی

حقوق کی پامالی اردو ادب کا ایک مستقل موضوع بن کر رہ گیا ہے۔ بھارتی حکومت کی استحصال پرستی اور بھارتی سکیورٹی فورسز کی درندگی نے ایک وسیع ذخیرہ ادب کو جنم دیا ہے۔"[۳۱]

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مسئلہ کشمیر کا اصل ذمے دار اقوام متحدہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقوام متحدہ کے ایک ذیلی ادارے سلامتی کونسل جس میں کشمیریوں کے حق خود اختیاری کی حمایت میں ایک سے زیادہ قرار دادیں اپنے عملی نفاذ کے لیے گزشتہ نصف صدی سے ترس رہی ہیں۔ اس کے پانچ میں سے چار مستقل ارکان ان قراردادوں کی لاشوں پر کھڑے ہو کر بھارت کو انسانی حقوق کی مزید پامالی کا درس رہے ہیں۔ یوں اس سے واضح ہوتا ہے کہ بھارت کے ریاستی جبر واستبداد کی کھلم کھلا حمایت کرنے میں اقوام متحدہ کے یہ چار مستقل ارکان مصروف عمل ہیں۔

اس ظلم واستبداد پر انسانی حقوق کی عالمی تنظیمیں اور اقوام عالم میں امن کی داعی عالمی طاقتیں خاموش تماشائی کا کردار ادا کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ گویا بھارتی جارحیت کو ان عالمی طاقتوں کی پشت پناہی حاصل ہے۔ اسی لیے بھارت جموں وکشمیر میں بلاخوف وخطر حریت پسندوں کو تشدد کا نشانہ بناتے چلا آرہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آزاد کشمیر کے شعرا دیگر شعرائے اردو کی طرح اس ظلم واستبداد اور عالمی خاموشی پر صدائے احتجاج اور مزاحمت کرتے نظر آتے ہیں۔ آزاد کشمیر کے ایک قوم پرست مزاحمتی شاعر نذیر انجم عالمی اداروں کو کشمیر میں ہونے والے ظلم وجبر کا ذمے دار قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک کشمیریوں کے قاتل یہی عالمی ادارے ہیں۔

عالمی استبداد کو فروغ دینے میں انہی عالمی طاقتوں کا ہاتھ ہے۔ کشمیر سمیت فلسطین، چیچنیا، بوسنیا افغانستان اور دیگر مسلم ممالک میں عالمی اور مغربی طاقتوں کی طرف سے ڈھائے جانے والے مظالم اس کا بین ثبوت ہیں۔ ان مسلم ممالک میں بنیادی انسانی حقوق کی کھلم کھلا پامالی ہوئی۔ ان گنت معصوم انسانوں کا خون بہا۔ فلسطین میں اسرائیل اور اس کے ہم نواؤں نے ظلم واستبداد کی داستانیں رقم کیں۔ اس سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ طاقت ور عالمی ادارے مظلوم ومحکوم انسانوں کے سروں کی منڈیاں لگائے بیٹھے ہیں۔ طاقت ور حکم رانوں کی ایما پر ان بے گناہ انسانوں کو بہیمانہ ظلم وجبر کا نشانہ بنایا جاتا رہا۔ مشرق ومغرب میں روز افزوں

انسانیت سوز واقعات پیش آتے رہے ہیں۔ آزاد کشمیر کے شعرا اس عالمی جبر پر گہری نگاہ جمائے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر افتخار مغل اس عالمی ظلم کی تصویر کشی ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ:

دیس بھی بیچے اور خریدے جاتے رہے ہیں دنیا میں
اور یہ قوموں کے سوداگر
مشرق، مغرب سب دیسوں میں
ایک ہی جیسے ہوتے ہیں
اک تھیلے کے چٹے بٹے، اک مسلک کے بندے ہیں
سکوں کی قیمت میں فرق تو ہو سکتا ہے
مظلوموں کے سروں کی قیمت
دنیا کی ہر منڈی میں
لگ بھگ ایک ہی جیسی ہے
یوں قیمت بے قیمت بکنا
ہر کم زور کی قسمت ہے [۳۲]

افتخار مغل کی نظم کے درج بالا اشعار سے بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا میں کم زور کی قسمت ایک جیسی ہے۔ ظالم اور جابر طبقہ ان مظلوم طبقے پر اپنی اجارہ داری قائم رکھے ہوئے ہے۔ افتخار مغل نے جابرانہ، استحصالی اور سامراجی نظام کے خلاف نعرہ مستانہ بلند کیا۔ اس ضمن میں مظفر آباد سے تعلق رکھنے والے شاعر آزر عسکری کی مزاحمتی شاعری بھی قابل غور ہے۔

؎ بہار جس کی تھی رشک جنت خزاں رسیدہ وہ گلستاں ہے
ستم کی چکی میں پسنے والے ستم زدوں کی یہ داستاں ہے
اے امنِ عالم کے پاس داروں تمھارا انصاف کہاں ہے [۳۳]

مذکورہ بالا مصرعوں میں آزر عسکری (مرحوم) مظلومی کشمیر اور مغمومی کشمیر پر امنِ عالم کے پاس داروں سے سوال کرتے ہیں کہ تمھارا انصاف اب کہاں ہے، جب کشمیر میں مسلمان ظلم و ستم کی چکی میں پس

رہے ہیں۔ اس بحث سے اقوام متحدہ جیسے عالمی انصاف کے اداروں کا عملی کردار واہوتا ہے۔ بنیادی انسانی حقوق کے علم برداروں اور انصاف کے دعوے داروں کو آزاد کشمیر کے مزاحمتی شعرا نے خوب للکارا ہے۔

مزاحمت اور جبر کی علامتیں

آزاد کشمیر کی رجحان ساز مزاحمتی شعرا کی شاعری کے بہ غور مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس مزاحمتی شاعری میں باقاعدہ جبر کی علامتیں موجود ہیں۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ یہ جبر کی علامتیں مختلف المعانی ہیں۔ ان جبر کی علامتوں میں خون، لہو، اندھیرے، روشنی، گردِ سفر، تاج و تخت، مسندِ اقتدار، دار و رسن، کوتاہ قد، حسین بن منصور، لہو کی روشنی، زنجیر و رسن، رات کی تاریکی، سحر کی سپیدگی، آواز، کشمیر، صدا، خواب، بے جہت مسافرت، جادہ پیمائی، مقبول بٹ، برہان وانی، کشمیر، سید علی گیلانی، یاسین ملک، جہلم، نیلم، ڈل، ولر، حرف اور ہوا وغیرہ زیادہ اہم ہیں۔

جبر کی ان علامات کے ذریعے یہاں کے شعرا نے اپنی شاعری میں مزاحمت کے مضامین باندھے ہیں۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر افتخار مغل اپنی شاعری میں ''لہو'' کی علامت پوری شد و مد کے ساتھ استعمال کی ہے۔ یہاں تک کہ افتخار مغل نے اپنے مجموعہ کلام کا عنوان بھی ''لہو لہو کشمیر'' رکھا۔ اس حوالے سے ان کی نظم ''بے گناہ لہو'' زیادہ اہم ہے۔

افتخار مغل نے نظم ''بے گناہ لہو'' میں تاریخی سانحات کا ذکر کرتے ہوئے مزاحمت کے رنگ اور مضامین اجاگر کیے ہیں۔ مثلاً حضرت حسینؓ ابن علیؓ جیسی معصوم اور بے گناہ ہستی کا ''لہو'' حق کی خاطر مزاحمت کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ افتخار مغل اس بے گناہ لہو کو صدیوں تک گونجنے کا جوہر قرار دیتے ہیں۔ مذکورہ نظم سے چنیدہ اشعار بہ ذیل ملاحظہ ہوں:

؎ لب فرات حسینؓ اِبن مرتضٰیؓ کا لہو
کنارہ دجلہ وہ خونِ حسینؒ بن منصور
وہ جوئے شیر کنارہ وہ کوہکن کا لہو
یہ ___ اور ایسے کئی اور بے گناہ لہو
ابھی بھی داغ ہیں تہذیب کے لبادے پر
ابھی بھی دامن ، انسانیت پہ دھبہ ہے

عجیب چیز ہے لوگو یہ بے گناہ لہو
کہ اس میں صدیوں تک گونجنے کا جوہر ہے[34]

کشمیری قوم نے قومی آزادی کے آدرش کے لیے اپنے لہو سے قربانیوں کی ایک بے مثال اور لازوال داستان رقم کی ہے۔ بھارت کی طرف سے ہونے والے ریاستی جبر کے نتیجے میں اہلِ کشمیر کو جس بے دردی سے قتل کیا گیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر کا کلچر "لہو یا خون کا کلچر" ہے۔ آزاد کشمیر کی شاعری میں خون یا لہو مزاحمت کی ایک بھرپور علامت ہے۔ آزاد کشمیر کے جن شعرا نے باقاعدہ اپنی منظومات کے عنوان میں بھی "لہو اور خون" کی علامت کو برتا ہے، ان میں آمنہ بہار کی نظم "شہیدوں کے لہو کی سرخیاں"[35]، اسرار ایوب کی "یہ لہو آنکھ میں"[36]، مشتاق شاد کی نظمیں "کریں گے ہم بہار خاک و خوں آراستہ"، "مرے لہو سے" اور "لہو کی آگ"[37]، کے علاوہ افتخار مغل کی منظومات میں "لہو مانگتی ہے چناروں کی دھرتی"[38]، "بے گناہ لہو"، "شبِ خون"، "خونِ ناحق" اور "خون میں ڈوبی ہوئی عید" قابلِ توجہ ہیں۔ افتخار مغل کی ایک نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جن میں "خون" کی علامت کو برتا گیا ہے۔

جو خون بہایا دھرتی پر
اُس اجلے خون کا ہر قطرہ
دھرتی کے پاس امانت ہے
اس خون کی نرمی بھی قائم!
اس خون کی گرمی بھی قائم!
اس خون کا رنگ فروزاں ہے
اس خون کا نور درخشاں ہے
اس خون کی سرخی باقی ہے ___ وہ خون ابھی تک زندہ ہے[39]

مزید براں اس ضمن میں یہ ذیل اشعار بھی قابل توجہ ہیں:

؎ اُس پاک لہو کا سندیسہ
چاہیں بھی تو بھول نہ پائیں
اس خون کا اور ان زخموں کا

اک قرض جو ہم پر واجب ہے

وہ قرض ابھی تک واجب ہے[40]

اسی طرح اس خطے کی شاعری میں لہو انسانی کے توسط سے دارورسن، کربلا، فرات، دجلہ، زنداں، مقتل، فصیل، وغیرہ بھی بہ طور علامات مستعمل ہیں۔ یہ علامات اس قدر مقبول ہوئیں کہ ان کو باقاعدہ شعری مجموعوں کے عنوانات میں جگہ دی گئی۔ مثلاً رفیق بھٹی کا شعری مجموعہ ''ستون دار''، مشتاق شاد کا ''لہو کے مہتاب''، نذر حسین نذرؔ کا ''فصیل کے اس پار'' اور ''ساگرؔ کا کوئے مقتل'' جیسے نام سامنے آئے۔ آزاد کشمیر کی مزاحمتی شاعری کے مطالعے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ لہو کی علامت ان شعرا نے مختلف المعانی اور وسیع تر مفاہیم میں برتی ہے۔ اس خطے کی شاعری میں یہ علامت جبر کی علامت کے ساتھ ساتھ قربانی، انقلاب، جہدِ مسلسل اور آزادی وخود مختاری کی علامت بھی ہے۔

تحریک آزادی کشمیر کی تاریخ میں ''مقبول بٹ''، برہان وانی، سید علی گیلانی اور یاسین ملک جیسے حریت پسند بھی مزاحمت کے استعارے اور علامات ہیں۔ ان شخصیات کو یہاں کی شاعری میں خوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ مقبول بٹ کو نہ صرف کشمیری شعرا نے مزاحمت کی آواز قرار دیا ہے بل کہ پاکستانی مزاحمتی شعرا کی شاعری میں بھی مقبول بٹ مزاحمت کی مضبوط اور توانا آواز کے طور پر نظر آتے ہیں۔ کشمیر کے اس فرزند کو جتنا شعر کے قرینوں میں استعمال کیا گیا اتنا اور کسی کشمیری شخصیت کو پذیرائی نہیں ملی۔

مقبول بٹ اپنے سیاسی نظریات اور مسلح جدوجہد آزادی کی بنا پر الحاق پسند اور اقتدار پسند حکم رانوں اور طبقوں کی نظر میں باغی اور غدار کردار سمجھے جاتے رہے ہیں۔ لیکن شعرا نے ریاستی جبر کی ان آندھیوں میں بھی مزاحمت کی اس آواز کو بہ طور علامت برتا۔ آزاد کشمیر کے شعرا کے علاوہ احمد فرازؔ جیسے پاکستانی مزاحمتی شعرا نے بھی مقبول بٹ شہید کو ظالم اور جابر مقتدر حکم رانوں کے سامنے ڈٹے رہنے اور جدوجہد آزادی کشمیر کی راہ میں شہادت پر منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ ان منظومات میں نذیر انجمؔ کی ''مقبول بٹ''[41] ایم یامینؔ کی ''اے روشنی کے شہید اول''[42]، رفیق بھٹی کی ''شہید وفا''[43]، افتخار مغل کی ''جو تو نے راہ سجھائی''[44]، ''چہرہ دار''[45] آمنہ بہار کی ''شہید آزادی''[46] اور نثار ہمدانی کی ''شہید کشمیر مقبول بٹ کی نذر''[47] زیادہ معروف ہیں۔ نذیر انجمؔ کی نظم ''مقبول بٹ'' سے چنیدہ اشعار بہ طور مثال ملاحظہ ہوں:

ے
اِک شہید وفا جاں نثار وطن
جس پہ نازاں رہے گی عروسِ چمن
بہرِ آزادی خطہ کاشمر
نقدِ جاں وار کے ہو گیا امر
سچ کی آواز کا پاسباں بن گیا
جبر کی رہ میں کوہِ گراں بن گیا
بڑھ کے زنجیر جوروستم توڑ دی
موج خوناب فسطائیت موڑ دی[۴۸]

ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ ''مقبول بٹ''لوحِ تاریخ پر مزاحمت اور جبر کی ایک علامت کے طور پر رقم ہوگیا ہے۔ آزاد کشمیر کے شعرا نے مقبول بٹ جیسے شہدا جو آزادی کشمیر کی خاطر اپنی جان نچھاور کرنے سے باز نہیں آتے، ان شہدا کے لیے منصور، سرمد اور مسیحا کی علامات برتی ہیں۔علاوہ ازیں مخلص وجدانی کی طویل نظم ''ابر گریزاں''میں ''بادل''کو جبر اور استحصال کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔

آزاد کشمیر کی مزاحمتی شاعری میں ''خواب'' بھی ایک اہم علامت ہے۔ یہ علامت ان شعرا کے ہاں آزادی اور روشن مستقبل کی علامت ہے۔ یہ خواب ہی ہوتے ہیں جو کسی شاعر کے قلب و ذہن میں مزاحمت اور انقلاب کے آثار کو جنم بخشتے ہیں۔افتخار مغل، نذیر انجم اور رفیق بھٹی کے ہاں ''خواب ''ہمیں ایک مربوط علامت کے پیراہن میں تبدیل ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ شعرا اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ بھارتی فوج کشمیریوں سے پیلٹ گن کے ذریعے سے بصارت سے محروم کرکے آنکھیں تو چھین سکتی ہے مگر ان آنکھوں میں سجائے آزادی کے خواب نہیں چھین سکتی۔یہ بات تمام مقتدر طبقوں کے لیے دعوتِ فکر کے مترداف ہے۔ یہ نہ صرف بند آنکھوں سے خواب دیکھتے ہیں بل کہ کھلی آنکھوں سے بھی خواب دیکھنے کی جسارت میں دیدہ دلیری دکھاتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ تو قاری کے ذہن کی صلاحیت پر منحصر ہے کہ وہ ان علامتوں کو اپنی ذہنی بساط کے مطابق کیا سمجھتا ہے۔ ان کو خواب سمجھے یا حقیقت جان کر آگے بڑھے۔بسا اوقات یہی خواب حقیقت کا روپ بھی دھار لیتے ہیں۔یہی وجہ ہے آزاد کشمیر کے شعرا بھی اپنی شاعری میں آزادی اور انقلاب کے خواب سجائے ہوئے ہیں۔

سماجی رویوں کے خلاف مزاحمت

کسی بھی ادب کو سماجی عمل سے علاحدہ کر کے نہیں سمجھا جا سکتا۔ چوں کہ ادیب اور شاعر سماج کے کسی نہ کسی طبقے کی نمایندگی کر رہا ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں شاعر یا ادیب سماج کی آنکھ کے مانند ہوتا ہے۔ اس بنا پر آزاد کشمیر کے شعری سرمایے میں سماجی مسائل اور منفی سماجی رویوں سے خلاف ایک قابلِ توجہ آواز موجود رہی ہے۔ یہاں کے شعرا و ادبا اپنے عہد کے سماجی رویوں سے بالکل بھی خائف نہیں رہے ہیں۔ انھوں نے فنِ شعر کو بھی محض حکایتِ جاں نہیں بننے دیا بل کہ اسے حدیثِ جہاں کا آئینہ بھی بنا کر رکھا ہے۔

آزاد کشمیر کے رجحان ساز شعرا کے ہاں ترقی پسند سوچ و فکر کی بنا پر یہاں کی شاعری میں سماجی فسطائیت، معاشی عدم مساوات، مثبت و منفی سماجی اقدار اور عام انسان کے سماجی مسائل موضوعِ شعر بنتے رہے ہیں۔ معاشی مسائل کا ادراک آزرؔ عسکری کی شاعری میں بہ خوبی نظر آتا ہے۔ انھوں نے ان معاشی مسائل کو جنم دینے والے ذمے داروں کے خلاف خوب آواز بلند کی۔

عہدِ حاضر میں منفی سماجی رویوں میں ایک منفی رویہ خوشامد کے عام رواج کا بھی ہے۔ ہمارے ہاں نااہل اپنے مفاد اور کام کے لیے صاحبِ اختیار طبقے کی طرح طرح سے خوشامد کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس فعلِ قبیح پر آزار عسکری نے نہایت دل چسپ انداز اور لطیف پیرایئے میں طنز کی ہے۔

ے
خوشامد سے آسان ہوں مشکلیں
خوشامد سے لائسنس پرمٹ ملیں
خوشامد سے اکثر منسٹر بنے
خوشامد سے کئی منزلہ گھر بنے[۴۹]

اس حوالے سے آزرؔ عسکری کی منظومات میں ''مکالمہ مابین شکم و صاحبِ شکم''، ''رزقِ حلال و مرگِ حرام''، ''پے کمیشن''، ''دو روٹیاں'' اور ''بلیکیے الوداع کہتے ہیں'' قابلِ ذکر ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر صابر آفاقی کی نظمیں ''روٹی'' اور ''اے۔جی آفس'' معاشی و سماجی مسائل کا احاطہ کرتی ہیں۔ آزاد کشمیر کے دیگر شعرا جن کی شاعری میں سماجی رویوں کے خلاف مزاحمت کی آواز بلند ہوتی ہے، ان میں رفیق بھٹی، اکرم طاہر اور آمنہ بہار سرِفہرست ہیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر آمنہ بہار کے نظمیہ اشعار ملاحظہ ہوں:

ے مرا ہے آج بھی فاقوں سے انسان دہر میں
لٹ چکی جن کی معیشیت، کٹ گیا تار حیات[50]

ے پس رہے آج بھی حالات میں
کتنے پنوں اور کتنی سسیاں[51]

مزاحمت کی کوئی ایک صورت نہیں ہوتی، شعرا کے ہاں یہ داخلی اور خارجی دو صورتوں میں مزاحمت ہو سکتی ہے۔ اس کی ایک صورت داخلی مزاحمت کا عمل ہے جس میں شعرا ہر وقت غوطہ زن رہتے ہیں۔ اس طرح شعرا شعوری اور لاشعوری ہر دو حوالوں سے یہ اپنے جوہر اور وجود کو قائم رکھنے کے لیے مزاحمت کا سامنا کرتے ہیں۔ درحقیقت یہی داخلی مزاحمتی عمل ہی خارجی مزاحمت کے نظام کا باعث بنتا ہے۔ البتہ یہ عمل دوطرفہ بھی ہو سکتا ہے۔

مزاحمتی رویہ کوئی ان جانی شے نہیں ہے بل کہ مزاحمت کا عنصر انسان کی سرشت میں شامل ہے۔ اسے ہر فرد پیدائش کے وقت ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے، عمر اور شعور بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس مزاحمتی رویے میں بھی وسعت آتی رہتی ہے۔ یہ مزاحمتی رویہ ہر فرد کے اندر کمی بیشی کے ساتھ وجود رکھتا ہے لیکن شعرا عام افراد کی نسبت اس رویے کا اظہار شعر کے قرینے میں خوب صورت اور متاثر کن طریقے سے کر دیتے ہیں۔ یہی کیفیت آزاد کشمیر کے شعرا کے ہاں بھی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے سماجی رویوں کے منفی اقدار کے خلاف اپنا قلم استعمال کیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ قدرت اللہ شہاب (فلیپ)، پلک پلک زنجیر از نذیر انجم، کاشر پبلشرز، میر پور، ۱۹۹۲ء

۲۔ نذیر انجم، قرضِ سخن، ارشد بک سیلرز، میر پور، ۲۰۱۱ء، ص۱۵۷

۳۔ نذیر انجم، پلک پلک زنجیر، کاشر پبلشرز، میر پور، ۱۹۹۲ء، ص۱۱۵

۴۔ نذیر انجم، قرضِ سخن، ارشد بک سیلرز، میر پور، ۲۰۱۱ء، ص۷۰

۵۔ نذیر انجم، پلک پلک زنجیر، کاشر پبلشرز، میر پور، ۱۹۹۲ء، ص۱۵۵

۶۔ افتخار مغل، ڈاکٹر، لہو لہو کشمیر، اجالا پبلی کیشنز، مظفر آباد، ۱۹۹۱ء، ص۲۱

۷۔ ایضاً، ص۸۷۔۸۶

۸۔ صابر آفاقی، ڈاکٹر، شہر تمنا، ادبیات، مظفر آباد، ۲۰۰۳ء، ص۵۸

۹۔ آمنہ بہار، چناروں کی آگ، علی پرنٹر، راول پنڈی، ۱۹۸۹ء، ص۱۳۹

۱۰۔ ایضاً، ص۱۱۶

۱۱۔ مشتاق شاد، نمبل، الحمد پبلشرز، میر پور، ۱۹۹۴ء، ص۴۳

۱۲۔ ایضاً، ص۵۴

۱۳۔ ایضاً، ص۱۰۹

۱۴۔ نذیر انجم، قرضِ سخن، ارشد بک سیلرز، میر پور، ۲۰۱۱ء، ص۱۶۶

۱۵۔ افتخار مغل، ڈاکٹر، آزاد کشمیر میں اردو شاعری، رُمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، راول پنڈی، ۲۰۲۰ء، ص۱۵۰

۱۶۔ نذیر انجم، قرضِ سخن، ارشد بک سیلرز، میر پور، ۲۰۱۱ء، ص۶۱

۱۷۔ ایضاً، ص۶۳

۱۸۔ افتخار مغل، ڈاکٹر، انکشاف، اساطیر، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص۵۶

۱۹۔ رفیق بھٹی، ستون دار، پنجال پبلشرز، میر پور، ۱۹۹۴ء، ص۸۳

۲۰۔ نذیر انجم، قرضِ سخن، ارشد بک سیلرز، میر پور، ۲۰۱۱ء، ص۶۱

۲۱۔ آصف اسحاق، آزاد کشمیر میں منتخب نظم گو شعرا کا فنی جائزہ، مقالہ برائے ایم فل اردو، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۱۹ء، ص۱۸

۲۲۔ مشتاق شاد، نمبل، الحمد پبلشرز، میر پور، ۱۹۹۴ء، ص ۴۴

۲۳۔ ایضاً، ص ۵۲

۲۴۔ ایضاً، ص ۱۲۹

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۲۷

۲۶۔ ایضاً، ص ۵۵

۲۷۔ ایضاً، ص ۵۶

۲۸۔ ایضاً، ص ۲۷

۲۹۔ ایضاً، ص ۸۷

۳۰۔ ایضاً، ص ۱۵۴

۳۱۔ فتح محمد ملک، تحریک آزادیِ کشمیر (اردو ادب کے آئینے میں)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۲۵

۳۲۔ افتخار مغل، ڈاکٹر، انکشاف، اساطیر، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۴۷

۳۳۔ صابر آفاقی، ڈاکٹر، کشمیر میں اردو کی مزاحمتی شاعری (مضمون)، مشمولہ پاکستان میں اردو، جلد ۵، فتح محمد ملک (مرتب)، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۶ء، ص ۳۳۱

۳۴۔ افتخار مغل، ڈاکٹر، لہو لہو کشمیر، اجالا پبلی کیشنز، مظفر آباد، ۱۹۹۱ء، ص ۵۸۔۵۷

۳۵۔ آمنہ بہار، چناروں کی آگ، علی پرنٹر، راول پنڈی، ۱۹۸۹ء، ص ۱۳۹

۳۶۔ اسرار ایوب، برف سے حرف، لیاقت پبلی کیشنز، میر پور، ۱۹۹۲ء، ص ۱۷

۳۷۔ مشتاق شاد، نمبل، الحمد پبلشرز، میر پور، ۱۹۹۴ء، ص ۱۵۴

۳۸۔ افتخار مغل، ڈاکٹر، لہو لہو کشمیر، اجالا پبلی کیشنز، مظفر آباد، ۱۹۹۱ء، ص ۲۱

۳۹۔ ایضاً، ص ۵۱

۴۰۔ ایضاً، ص ۵۲

۴۱۔ نذیر انجم، پلک پلک زنجیر، کاشر پبلشرز، میر پور، ۱۹۹۲ء، ص ۱۷۰

۴۲۔ ایم یامین، اے روشنی کے شہید اول (نظم)، مشمولہ ہفت روزہ کشمیر، مظفر آباد، مقبول بٹ نمبر، فروری ۱۹۹۴ء، ص ۲۳

۴۳۔ رفیق بھٹی، ستون دار، پنجال پبلشرز، میر پور، ۱۹۹۴ء، ص ۸۲
۴۴۔ افتخار مغل، ڈاکٹر، لہو لہو کشمیر، اجالا پبلی کیشنز، مظفر آباد، ۱۹۹۱ء، ص ۸۴
۴۵۔ افتخار مغل، چہرہ دار (نظم)، مشمولہ سہ ماہی شوق، میر پور، مارچ ۱۹۹۵ء، ص ۴۳
۴۶۔ آمنہ بہار، چناروں کی آگ، علی پرنٹر، راول پنڈی، ۱۹۸۹ء، ص ۵۴
۴۷۔ نثار ہمدانی، چنار، چاندنی اور چنبیلی، کشمیر سوسائٹی، مظفر آباد، س ن، ص ۸۲
۴۸۔ نذیر انجم، قرضِ سخن، ارشد بک سیلرز، میر پور، ۲۰۱۱ء، ص ۱۳۹
۴۹۔ رحمت علی خان، آزر عسکری شخصیت و فن، مقالہ برائے ایم فل (اردو)، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۴ء، ص ۲۱۲
۵۰۔ آمنہ بہار، چناروں کی آگ، علی پرنٹر، راول پنڈی، ۱۹۸۹ء، ص ۳۲
۵۱۔ ایضاً، ص ۸۵

باب سوم:

آزاد کشمیر کی اردو غزل میں مزاحمتی عناصر

آزاد کشمیر میں اردو نظم کے برعکس اردو غزل میں مزاحمت کی روایت خاصی قدیم ہے۔اس کی قدامت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ آزاد کشمیر کی اردو غزل میں مزاحمتی رجحان کا آغاز یہاں کی اردو شاعری کے ساتھ ہی ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ آزاد کشمیر کے اولین شاعر طالبؔ گورگانی کی غزل میں ہمیں مزاحمتی رویے نظر آتے ہیں۔ گو کہ یہاں کی غزل میں نظم کی نسبت مزاحمت کی آواز دھیمی ہے مگر زیادہ مؤثر ہے۔ آزاد کشمیر کی اُردو شاعری کی تاریخ کے مطالعے سے اس بات کا بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اِس میں بھی ہر عہد میں کسی نہ کسی شکل میں، کہیں نہ کہیں احتجاج اور مزاحمت موجود رہی ہے۔شاعری کی دیگر اصناف سے قطع نظر غزل جیسی نازک اور لطیف صنف میں بھی مزاحمت اور احتجاج کی لہر کہیں واضح اور کہیں مدھم دکھائی دیتی ہے۔

غزل کا ہر شعر معنی کے اعتبار سے ایک منفرد اور آزاد اکائی ہوتا ہے۔اس لیے ایک ہی غزل میں اگر کوئی شعر حسن و عشق کی ترجمانی کرتا ہے تو دوسرا شعر حکایتِ روزگار سناتا ہے یا زندگی کے دیگر پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔شاعر عام انسان سے قدرے زیادہ حساس طبع کا مالک ہوتا ہے۔اس لیے وہ اپنے گرد و پیش کے حالات کا مشاہدہ و مطالعہ بہ نظر غائر کرتا ہے۔ سماج کے حسن و قبح کو من و عن پیش کر کے سب کو آئینہ دکھا دیتا ہے۔احتجاج اور مزاحمت انسانی سرشت میں شامل ہے۔اس لیے شعرا نے ہر عہد میں اپنے زمانے کی ترجمانی کرتے ہوئے مزاحمت کو اپنی تخلیقات کا حصہ بنایا۔

آزاد کشمیر کے شعرا پر تقسیم ہند سے قبل اور مابعد کے مختلف سیاسی و سماجی واقعات نے اثرات مرتب کیے۔ خصوصاً تحریک آزادی، فسادات اور ہجرت کے تلخ واقعات نے ان شعرا کی فکر پر گہرے اثرات سے دوچار ہوئی۔ اسی لیے آزاد کشمیر کی غزل میں دیگر مضامین کے ساتھ ساتھ حبِ وطن، اہل کشمیر کا درد، آزادی کی تڑپ، سیاسی و سماجی ظلم کے خلاف مزاحمت کے رنگ نمایاں ہیں۔اس تقسیم ہند نے آزاد کشمیر کے سیاسی و جغرافیائی منظر نامے کو بری طرح متاثر کیا۔ کشمیر کی جبری اور غیر فطری تقسیم نے شعر و ادب پر دور رس اثرات چھوڑے۔اس حوالے سے پروفیسر فرزانہ ناز بحث کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں کہ:

> ”کشمیر ۱۹۴۷ء کے بعد جموں کشمیر، آزاد کشمیر اور شمالی علاقہ جات میں منقسم ہو گیا۔۔۔سیاسی منظر نامے میں ہمیں حد متارکہ نظر آتی ہے جو جغرافیے کے ساتھ ساتھ رشتوں کو بھی تقسیم کرتی ہے جو تہذیب و ثقافت، مذہب خیالات و نظریات میں اشتراک کے باوجود طویل اور صبر آزما جدائیوں کا سبب ہے لیکن پہرے تو سرحدوں پر بٹھائے جاسکتے ہیں تخیل اور سوچ پر نہیں۔کشمیر کی تقسیم غیر فطری اور جبری تھی،اس نے تمام نظامِ حیات کے ساتھ شعر وادب کو بھی متاثر کیا۔“[1]

یہاں کی مخصوص سیاسی وسماجی پس منظر کی وجہ سے آزاد کشمیر کے اردو شعرانے غزل میں بھی بھرپور انداز میں مزاحمتی مضامین اور عناصر خوبی کے ساتھ سموئے ہیں۔اگرچہ غزل کا مزاج کسی خاص موضوع کو تسلسل کے ساتھ اظہار کے لیے موزوں نہیں لیکن یہاں کی اردو غزل میں شعرانے کشمیر اور اس میں ہونے والے مظالم کو موضوع سخن بنایا ہے،اس بنا پر یہاں کی غزل اپنی رمزیت اور ایمائیت کی بنیاد پر احتجاج اور مزاحمت کا خوب صورت وسیلہ بنی۔اسی طرح آزاد کشمیر کے اردو شعرا کے ہاں سیاسی حسیت، سیاسی شعوراور جبر کے خلاف توانا آواز دیکھنے کو ملتی ہے۔

ے دیا ہے جس نے ہر اک منزل پہ دھوکا
اسے رہبر بنانا چاہتا ہوں[2]

آزاد کشمیر کے اردو شعرانے اپنی مٹّی کا قرض چکانے کی بھرپور سعی کی ہے۔اس ضمن میں ان شعرا کی کشمیر سے محبت اور اس سے والہانہ وابستگی کا یہ عالم ہے کہ یہاں کے شعرانے حب الوطنی کے پس منظر میں پورے پورے شعری مجموعے تخلیق کیے ہیں۔اس سلسلے میں امین طارق قاسمی کا ”جہاد کشمیر“، نذیر انجم کے ”پلک پلک زنجیر“اور نفس نفس تعزیر“، نثار ہمدانی کا ”چنار،چاندنی اور چنبیلی“، افتخار مغل کا ”لہو لہو کشمیر“ آمنہ بہار کا ”چناروں کی آگ“، مشتاق شاد کا ”لہو کے مہتاب“ اور رفیق بھٹی کا ”لہو نگر“ جیسے شعری مجموعے بہ طور خاص قابل توجہ ہیں۔اگرچہ ان مجموعہ ہائے کلام میں شاعری کے سبھی مضامین موجود ہیں لیکن کشمیر سے متعلقہ موضوعات، شہروں میں پھیلا ہوا کرب، اس کی شاہ راہوں اور گلی کوچوں میں بکھرا ہوا خون، جبر واستبداد جیسے مضامین، ان مجموعوں کا خاصا ہیں۔

آزادی وخود مختاری

اہلِ کشمیر طویل عرصے سے شدید سیاسی دباؤ کا شکار رہے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ تاریخ کے مختلف ادوار میں کشمیریوں کی آزادی کو پامال کرنے کی سعی کی جاتی رہی ہے۔ کشمیر پر سیاسی اثر ورسوخ اور بیرونی مداخلت کا سب سے بڑا سبب یہاں کے قدرتی وسائل اور اس کا حسن ہے۔ دوسروں لفظوں میں کشمیر وسائل کے اعتبار سے سونے کی چڑیا ہے۔ کشمیر کا یہی حسن اور بے پناہ قدرتی وسائل ہمیشہ سے سیاسی طالع آزما قوتوں کی توجہ اور ہوس کا مرکز بنے رہے ہیں۔

کشمیریوں نے اپنی آزادی کے حصول کے لیے نسل در نسل قربانیاں دی ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد ریاست جموں وکشمیر کے دونوں اطراف آزادی وخود مختاری کی جو لہر شروع ہوئی، نصف صدی سے زائد کا عرصہ گزر جانے کے باوجود ہنوز جاری و ساری ہے۔ کشمیر کی عوام اپنے حقوق اور بقا کی جنگ میں مسلسل سرگرمِ عمل دکھائی دیتی ہے۔اس لیے آزاد کشمیر کی اردو شاعری میں مزاحمتی رویے اور عناصر موجود ہونا قدرتی امر ہے۔ کشمیریوں کی ساری تاریخ مزاحمت اور جہدِ مسلسل سے بھرپور ہے۔ سولھویں صدی کے قریباً نصف حصے کے بعد مغل حکم ران اکبر بادشاہ کے ہاتھوں کشمیریوں کی اندرونی خود مختاری اور آزادی سلب ہوئی، جس سے یہاں مزاحمت کی نہ ختم ہونے والی داستان شروع ہوتی ہے۔ جو لمحہ تحریر تک کسی خاطر خواہ انجام تک نہیں پہنچ سکی۔ غزل میں مزاحمت کا یہ رویہ ایمائیت اور رمزیت کے پردے میں دکھائی دیتا ہے، جس سے اظہار بھی ہو جاتا ہے اور شاعر مقتدر طاقتوں کی گرفت سے بچ نکلنے میں کام یاب بھی ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر بہ ذیل غزلیہ اشعار ملاحظہ ہوں:

ے محیط برسر مقتل ہے تیغِ خوں آشام
یہ دستِ تیغ ہٹاؤ بڑا اندھیرا ہے[۳]

ے اٹھو کہ مادرِ کشمیر ہے ملول و حزیں
بڑھو کہ جموں و کشمیر نے پکارا ہے[۴]

یہاں کی اردو غزل میں بھی نظم کی طرح حب الوطنی کا یہ رنگ اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ موجزن ہے۔اس غزلیہ شاعری میں کشمیر سے انسیت، کشمیر کی یاد، کشمیر کی آزادی، کشمیر میں ہونے والے جبر کے خلاف آواز وغیرہ قابلِ توجہ ہیں۔مثال کے طور پر بہ ذیل اشعار میں آزادی کی تڑپ قابل دید ہے۔

؎ کسی کے لب پہ شکوہ ہو نہ پھر اپنے اجڑنے کا
تمنا ہے مرا کشمیر یوں آباد ہو جائے
غلامی کے سیاہ بادل چھٹیں اب کہساروں سے
الٰہی! وادی جنت نشاں آزاد ہو جائے[۵]

ڈاکٹر صابر آفاقی کی نظمیہ شاعری کی طرح غزلیہ شاعری میں بھی مزاحمت کا رنگ بھرپور ہے۔ان کے ہاں ایک سے بڑھ کر ایک مزاحمتی رنگ کا شعر موجود ہے۔ان کے اشعار سے بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے رگ وپے میں کشمیر کی آزادی کے لیے تڑپ اور کشمیریوں سے گہری وابستگی رچی بسی ہوئی ہے۔ان کی شاعری کشمیری عوام کے احساسات کی بھرپور ترجمانی کرتی ہے۔ان کے نزدیک کسی (پاکستانی و بھارتی) کارخانے میں بننے والے بم سے کشمیریوں کے دلوں اور یہاں کی زمین سے ہزار نوحے سنائی دیتے ہیں چوں کہ ان بموں سے کشمیریوں کی دھرتی اور ان کے معصوم جسم چھلنی ہونے ہوتے ہیں۔اس لیے ان کی غزل کشمیریوں اور اپنی مٹّی سے گہری محبت کا ثبوت فراہم کرتی ہے، جس میں مزاحمت کی لے بھی شامل ہوتی ہے۔

؎ جو ایک بم کہیں ڈھلتا ہے کارخانے میں
ہزار نوحے زمیں سے سنائی دیتے ہیں[۶]

نذیر انجم آزاد کشمیر کے معروف مزاحمتی شاعر ہیں۔اس خطے میں مزاحمتی رویوں کی رجحان سازی اور ان کے فروغ میں اُن کی خدمات قابلِ لحاظ ہیں۔چوں کہ نذیر انجم قوم پرست فکر کے حامل ہیں، اسی لیے ان کے کلام میں مزاحمت کا رجحان آزاد کشمیر کے تمام شعرا کی نسبت زیادہ ہے۔بہ ذیل شعر ان کے خود مختار نظریے کی نشان دہی کرتا ہے۔

؎ نعرہ ہی نہیں ایمان ہے یہ آزادی کے متوالوں کا
کشمیر کا ذرہ ذرہ ہے کشمیر کے رہنے والوں کا[۷]

نذیر انجمؔ کا مذکورہ بالا نمایندہ شعر آزاد کشمیر کے نوجوانوں میں زبان زد عام ہے۔ بالخصوص قوم پرست طبقے کا یہ عقیدہ بن چکا ہے کہ کشمیر کو اب آزاد اور خود مختار ہونا ہے۔ مختصراً کشمیری اب ہر صورت میں آزادی چاہتے ہیں۔ نذیر انجم کی شاعری میں مزاحمت اور احتجاج کی لے سب سے توانا ہے۔ وہ اس آزاد خطے کے اہم ترین اور رجحان ساز مزاحمتی شاعر کے طور پر ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ حبیب جالب جو کہ خود بہترین مزاحمتی اور انقلابی شاعر ہیں، وہ نذیر انجم کو محکوم قوموں کی آزادی کا میر کارواں قرار دیتے ہیں۔

> "نذیر انجمؔ ظلم و جبر کی زنجیریں توڑنا اور وادی غنچہ و گل کشمیر کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں۔۔۔ وہ محکوم اقوام کی آزادی اور قیام امن کے لیے جو کچھ لکھتے ہیں وہ ایک ایسا ترانہ بن جاتا ہے جو درماندہ کارواں کو پھر سے جادہ پیما کر سکتا ہے۔"[۸]

اہلِ کشمیر کسی بھی قیمت پر آزادی حاصل کرنا چاہتے ہیں، اس کے لیے تن من دھن کی بازی لگانے کے لیے ہمہ وقت تیار ہیں۔ آزادی جیسی عظیم نعمت کے حصول کی غرض سے اپنی جان کی قربانی دینے کو اپنے لیے اعزاز سمجھتے ہیں۔ نیز اس مشن پر پابند سلاسل ہونے میں بھی مسرت محسوس کرتے ہیں۔ غرض اہلِ کشمیر آزادی کے لیے کسی بھی قسم کی قربانی دینے سے باز نہیں آتے۔ اہلِ کشمیر کے دلوں میں موجود اس جذبے کی عکاسی افتخار مغل بہ ذیل شعر میں کرتے ہیں۔

ؔ مجھے اس کی گلیوں میں مصلوب کر دو مجھے اس کی شاہ راہوں پر دار کر دو
مگر زندگی کا نشاں بن کے چمکے یہ میرا وطن، میرے خوابوں کی دنیا[۹]

حقیقی آزادی اس کیفیت کو کہتے ہیں کہ جو معنوی ہو۔ یہ ایک ایسا نظام اور فضا ہے جو کسی قدغن کو قبول نہیں کرتا۔ ان معنوں میں نذیر انجمؔ کی مزاحمتی شاعری حریت اور انقلاب کی روح ہے، جس کا کوئی متبادل نہیں۔ آزادی عبارت ہے ایک ایسی فضا سے جس سے عدل و انصاف کی قدروں کی نشو و نما ہو۔ اس حوالے سے نذیر انجم کی شاعری معنوی افق پر پہلو دار ہے۔ ان کی شاعری میں ظلم اور ناانصافی کے خلاف احتجاج اور بغاوت کی زبردست پکار ہے۔ نذیر انجم کی شاعری میں قنوطیت اور یاسیت کے مضامین کی بہ جائے رجائیت سے مملو ہے۔ ان کی شاعری سنگینی حالات کے باوجود جدوجہد آزادی کی کام یابی کے نتیجے میں خوب صورت اور روشن دنوں کا مژدہ سناتی ہے۔

ے جھلملاتے ہیں صبح کے آثار
ٹوٹنے کو ہے تیرگی کا حصار[10]

ے چھٹ ہی جائے گی شبِ غم کی سیاہی اک روز
عہدِ آشوب شبِ تار گذر جائے گا[11]

کشمیریوں کو اس بات کا بہ خوبی احساس ہے کہ آزادی کشمیر کی منزل کی طرف جانے والا راستا اگرچہ کٹھن ہے مگر اہلِ کشمیر اس پُر خار راستے پر آزادی کا عزم و شوق لیے رواں دواں ہیں۔ نذیر انجم کو اس بات کا قلق ہے کہ کہیں ادراک کی کھیتیاں بنجر نہ ہو جائیں اور کہیں انسانیت کا درد رکھنے والوں کے ہاں یہ احساس کا جذبہ پتھر نہ بن جائے۔ یہ خاموش لبوں کو تحرک دینے کی خاطر اس کا اظہار کیا ہے۔

ے کشتِ ادراک نہ بنجر ہو جائے
کہیں احساس نہ پتھر ہو جائیں[12]

آزادی کی آرزو لیے کشمیری کئی برسوں سے جہدِ مسلسل کا حصہ ہیں۔ اب کشمیریوں کی تمنا ہے کہ آزادی صبح کا نظارہ کریں۔ ظلم کو اب شکست ہو، دارورسن کی کہانی کا خاتمہ ہو جائے۔ کشمیر کے شہروں اور دیہات میں جو معصوم کشمیریوں کے لاشے اٹھ رہے ہیں، اس جبر سے خطہ کشمیر تاراج ہے، کشمیری اب اس جبر کے راج کا ہمیشہ کے لیے انصاف اور خوش حالی سے مبدل چاہتے ہیں۔ کشمیر میں ہر خونی سانحے کے بعد آزادی کی یہ تمنا شدت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ اہلِ کشمیر کے ہاں اب آزاد فضاؤں میں سانس لینے کی تڑپ روزافزوں بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ ان جذبات کو افتخار مغل شعر کے قالب میں یوں ڈھالتے ہیں۔

ے اب ختم بھی ہو دارورسن کی یہ کہانی
قاتل تو بہت دیکھے مسیحا بھی تو دیکھوں[13]

ے اب ظلم کا پندار شکستا بھی تو دیکھوں
ہوتا ہوا جبروت کو پسپا بھی تو دیکھوں[14]

گزشتہ قریباً ستر برسوں سے خطہ آزاد کشمیر میں آزادی کی تحریک کے اس سفر میں کئی پیچ و خم آئے، کئی اہم واقعات نے اس مشن کو مزید تحریک دی۔ آزادی کا یہ مشن ہر نئے ظلم و بربریت کے واقعے کے بعد ایک نیا موڑ لیتا ہے، کبھی کسی حریت راہ نما کو پھانسی کے بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے، کبھی ان آزادی کے متوالوں کو

جبری طور پر پابندِ سلاسل کر دیا جاتا ہے، کبھی ان محکوم کشمیریوں کے گھروں کے تقدس کو پامال کرتے ہوئے، بے جا طور پر ان کی تلاشیاں لی جاتی ہیں۔ کبھی ان کے گھروں کو خواہ مخواہ نذرِ آتش کر دیا جاتا ہے۔ کبھی تو بھارتی یا پاکستانی توپوں سے نکلنے والے بموں سے ان بے گناہ کشمیریوں کے گھروں کو جلا کر راکھ کر دیا جاتا ہے۔ جنگ اور بم باری سے حدِ متار کہ (LOC) کی دونوں جانب کشمیریوں اور ان کے قیمتی املاک کو ہی نقصان پہنچتا ہے۔ اہلِ کشمیر کے ہاں اس ظلم و جبر کے باوجود آزادی کی خواہش اور آرزو میں مزید شدت آتی جا رہی ہے۔ ان کے ہاں آزادی کشمیر پر غیر متزلزل ایمان ہے۔ آزادی پر ان کے اس مضبوط ایمان و ایقان اور آزادی کی پھر سے بات چل نکلنے کی نشان دہی بہ ذیل اشعار سے ہوتی ہے۔

؎ بات سے پھر کنارے جہلم پڑی چل
جب کوئی لاشہ کنارے آ لگا بارش کے بعد[۱۵]

؎ مجھے یقین ہے عدو کی مچان ٹوٹے گی
مچان بچ بھی گئی تو کمان ٹوٹے گی[۱۶]

شاعر کو پختہ یقین ہے کہ عدو کی مچان اور کمان ٹوٹے گی۔ وہ لمحے دور نہیں جب اہلِ کشمیر کی آزادی کی خاطر پیش کی جانے والی قربانیاں رنگ لائیں گی۔ باشند گان کشمیر آزادی کی پر فضا منظر دیکھنے کو منتظر ہیں۔ ہر گزرنے والا لمحہ آزادی کی منزل کو قریب تر کرنے کا موجب بن رہا ہے۔ آزاد کشمیر کی اردو شاعری میں جا بہ جا آزادی کی نوید سنائی دیتی ہے۔

سماجی رویوں کے خلاف مزاحمت:

آزاد کشمیر کی بدلتی ہوئی سماجی حیثیت کی بنا پر یہاں کے شعرا نے سماجی سطح پر مزاحمتی انداز کو اپنایا، اپنی شاعری میں اِس گھٹن زدہ نظام کے خلاف بھرپور آواز بلند کی۔ یہ آواز اُس نظام کے بھی خلاف ہے جس میں سماجی جبر کو مزید تقویت ملی۔ یہاں سماجی سطح پر اس نظام کے خلاف آواز سامنے آئی جس میں بے گناہ انسانوں کو سماجی روئیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جس نظام میں بے گناہ انسانوں کو درندگی کا شکار بنا کر موت کے آغوش میں دھکیل دیا جاتا ہے۔ اسی طرح یہ آواز اس نظام کے خلاف بھی ہے جس میں کئی شہریوں پر ظلم و جبر کے پہاڑ توڑنے کے بعد ان کے خون کے ذریعے سے دریائے جہلم اور نیلم کے پانی کو سرخ کر دیا جاتا ہے۔ اس

مزاحمت میں سماج کے رویوں کے خلاف بھی توانا آواز دیکھنے کو ملتی ہے۔ جیسے ڈاکٹر صابر آفاقی کا بہ ذیل شعر مزاحمتی رنگ لیے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔

؎ عدو نے پاؤں جو توڑے تو معجزہ یہ ہوا
کہ سر کے بل تیری جانب جبیں چلنے لگی[۱۷]

نذیر انجم نے اپنی شاعری میں اسی سماج کی مختلف منافقتوں اور ریاکاریوں پر سخت مزاحمتی رویہ اپنایا ہے۔ ان کی یہ مزاحمت ان کی شخصیت کی طرح بلند ہے، اس میں ابتذال کا شائبہ تک نہیں۔ ہمارے سماج میں گفتار کے غازی بننے کا عام وتیرہ چل نکلا ہے، بے عملی بھی اس معاشرے کا عام رویہ ہے۔ اپنے ذاتی مفاد کی خاطر دوسروں کو باہمی چپقلش اور لڑائی جھگڑے میں دھونس دینا بھی ہمارے سماجی مسائل میں سے ایک ہے۔ مذہبی منافرت تو ایک سلگتا ہوا سماجی مسئلہ ہے، مذہب کے نام پر ہمارا متشدد رویہ ہمارے سماجی ماحول کو خراب کرتا ہے۔ ان تمام عوامل پر شعرا جو کہ حساس طبعیت کے مالک افراد ہوتے ہیں، کیسے چشم پوشی کر سکتے ہیں۔ سماج کے ان منفی رویوں کے خلاف مزاحمتی رویہ اپنانا ان شعرا کے ہاں فطری امر ہے۔ بہ ذیل چند اشعار ملاحظہ ہوں جن میں شاعر نے سماج کے ان ہی منفی رویوں کو ہدف تنقید بناتے ہوتے ہوئے، مزاحمتی رویہ اپنایا ہے۔

؎ خطیب شہر کے ہاتھوں بنام مذہب ودین
منافرت کی چلی ہیں روایتیں کیا کیا[۱۸]

؎ عمل سے کرتے رہے اپنے قول کی تکذیب
زباں سے شیخ جی مصروفِ وعظ و پند رہے[۱۹]

؎ علم جن کو نہیں زمینوں کا
بات کرتے ہیں آسمانوں کی[۲۰]

ہمارے سماج میں ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ یہاں لوگوں میں وہ پہلے سا محبت کا چلن نہیں رہا۔ خصوصاً شہروں میں ایک دوسرے سے باہمی ہم دردی، اخوت، بھائی چارہ اور خوشی غمی میں شراکت داری ختم ہوتی جارہی ہے۔ حالاں کہ ان کے گھروں کی قربت تو بہت ہے مگر افراد کی قربت سے خالی ہیں۔ شہروں میں مکان تو باہم یک جا ہوتے ہیں، دیوار سے دیوار ملی ہوتی ہے مگر ان کے دلوں میں کدورت کے علاوہ ایک دوسرے

کے دکھ سکھ سے بے خبر کی خصوصیت پائی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں اس سماج میں عدم برداشت کی بنا پر باہمی نفاق اور دشمنی جیسی برائیاں جنم لے رہی ہیں۔ انسانیت میں یہ دشمنی ان ہی انسانوں کی دین ہے۔ اپنے چھوٹے چھوٹے معاملات کو افہام و تفہیم سے سلجھانے کی بہ جائے الجھانے کا رواج چل نکلا ہے جس سے زمانہ جہالیت کی طرح سماج میں کدورت، کینہ اور بغض جیسی برائیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ ان سب برائیوں کے خلاف بھی یہاں کے شعرا نے مزاحمتی رویہ برتا ہے۔ یہاں کی شاعری میں ان سماجی برائیوں اور منفی سماجی اقدار کے خلاف بھرپور اظہار ملتا ہے۔ جس کی شعری مثالیں بہ ذیل ملاحظہ ہوں۔

؎ لوگ اور بھی اک دوسرے سے دُور ہوئے ہیں
یوں، شہر میں دیوار سے دیوار لگا کر[۲۱]

؎ دشمن انسان کا آسماں تو نہیں
خود ہی دست و گریباں ہیں اہلِ زمیں[۲۲]

؎ دُکھ بٹایا نہ کسی کا تو تعجب کیسا
ہم تو خود اپنے لیے باعثِ آزار رہے[۲۳]

ہمارے سماج میں طبقاتی کش مکش، سرمایہ دارانہ نظام اور جاگیر درانہ نظام، بھوک اور افلاس کو جنم دے رہا ہے۔ اس نظام کی بدولت مزدور اور محنت کش طبقے کو اپنی محنت کا پورا پورا نفع نہیں ملتا۔ نتیجتاً غریب مزید غریب تر اور سرمایہ دار یعنی امیر مزید امیر تر کی روش کو فروغ مل رہا ہے۔ ہمارے ملک کی آبادی کا معتدبہ حصہ خطِ غربت سے نیچے زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ سرمایہ دارنہ نظام کی وجہ سے اس محنت کش طبقے کے ہاں فاقوں تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ جن کھیتوں میں یہ کام کرتے ہیں انہی سے فاقوں کی ہوک اٹھتی ہے۔ مزدور کو وقت پر اس کی محنت کی اجرت نہ دینا، ہمارا سماجی رویہ بن چکا ہے، شاعر نے اس مسئلے کو بہ ذیل شعر کے توسط سے شعری قالب میں یوں ڈھالا ہے۔

؎ فگار سینوں میں فاقوں سے ہوک اٹھتی ہے
اُجاڑ کھیتوں میں برسوں سے بھوک اُگتی ہے[۲۴]

مذکورہ بالا شعر میں محنت کش طبقے کے دل جو جاگیر داروں اور سرمایہ داروں کے سخت اور منفی رویے سے چور چور ہیں، ان میں فاقوں اور بھوک سے ہوک اٹھتی دکھائی دیتی ہے۔ مزدور کو اس کی محنت و مشقت کا

پورا پورا صلہ نہیں دیا جاتا جو کہ اس طبقے کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہے، سماج کے اس منفی رویے کے خلاف اہلِ قلم حضرات نے بھرپور مزاحمت کی ہے۔

اسی طرح موجودہ سماج میں باعزت روزگار کا حصول بھی ایک سماجی مسئلہ بن چکا ہے۔ سرمایہ داریت، جاگیرداریت، بدعنوانی سمیت اس سفارشی و رشوت خوری کے نظام کے باعث روزگار ایک سنگین مسئلے کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ روزگار میسر نہ ہونے کی وجہ سے کئی افراد خودکشی کرنے پر مجبور ہیں۔ اس سماج میں مقتدر حلقوں اور ثروت مند طبقات کے سوا سب کو فکرِ معاش اور غمِ روزگار ستائے جا رہا ہے۔ اس مسئلے کی کئی اہم وجوہات ہیں، اہلِ قلم نے اس سماجی مسئلے کی نشان دہی کرنے علاوہ اس کو جنم دینے والے عناصر کے خلاف اپنے قلم کا مؤثر استعمال کیا ہے۔ مثلاً افتخار مغل کے نزدیک یہ مسئلہ ایک بلا سے کم نہیں۔

غمِ حیات ، غمِ روزگار ، فکرِ معاش
گر ان بلاؤں کو ٹالیں تو اس کی باتیں ہوں[۲۵]

یہاں کے شعری سرمائے میں اہلِ قلم نے اپنے اپنے اسلوب میں ان سماجی رویوں کو اپنی قلمی مزاحمت سے روکنے کی مساعی جمیلہ کی ہے۔ گویا اردو ادب کے دیگر شعرا کی روایت کو زندہ رکھتے ہوئے آزاد کشمیر کے شعرا نے بھی سماجی رویوں کے خلاف آواز بلند کی ہے۔

جبر اور مزاحمت کی علامتیں:

آزاد کشمیر کی شاعری میں دیگر مزاحمتی عناصر کے ساتھ ساتھ جبر کی علامتیں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ یہاں کی غزلیہ مزاحمتی شاعری میں جبر کی یہ علامات، مختلف المعانی مفاہیم کے تحت مستعمل ہیں۔ آمریت اور مطلق العنان انتظامیہ کے دور میں ان علامات کے ذریعے یہاں کے شعرا نے مزاحمتی فکر کو جلا بخشی ہے۔ یہاں کے شعرا میں اکرم طاہر نے مزاحمتی رویے کو اجاگر کرنے کے لیے "اندھیرے" اور "روشنی" کو بہ طور علامت برتا ہے۔ نذیر انجم کی مزاحمتی شاعری کا پس منظر سیاسی نوعیت کا ہے نیز وہ خود مختار نظریے کے حامی بھی ہیں۔ انھوں نے ریاستی جبر کے سلسلے میں مقتدر اداروں اور حکم رانوں کو قاتل قرار دیا ہے۔ اس لیے ان کی شاعری میں "دار و رسن"، "منصور"، "مقتل"، "تاج و تخت"، "زنداں"، "طوق و رسن"، "دار" اور "مسند اقتدار" وغیرہ مزاحمت اور جبر کی علامات ہیں۔ ان شعرا کے ہاں "دار و رسن" فتح اور

کام یابی کی علامت ہے۔ دیگر علامات میں سے تاج و تخت، مسند اقتدار اور مقتل بہ طور خاص جبر کی علامتیں ہیں۔

یہاں کے شعرا میں ان علامات کے حوالے سے معنوی اختلاف بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ مثال کے طور پر احمد شمیم کے ہاں ''ہوا'' جبر، بدنیتی اور ریاکاری کی علامت ہے جب کہ شعرا کی نسلِ نو کی شاعری میں ''ہوا'' آزادی، تازگی، اناپسندی اور خود مختاری کی ایک بھرپور اور بلیغ علامت کے طور پر برتا گیا ہے۔ اسی طرح ''اندھیرا یا تاریکی'' اور ''سحر'' بھی جبر کی علامات ہیں، یہاں کی شاعری میں یہ دونوں علامتیں بالترتیب ''غلامی'' اور ''آزادی'' کی علامتیں ہیں۔ ان علامات کے حامل چند اشعار بہ ذیل ملاحظہ ہوں۔

؎ شب کی تاریکی گریزاں ہے سحر کے سامنے
کیسے کیسے منظر آتے ہیں نظر کے سامنے[۲۶]

؎ وہ آدمی جو اندھیروں میں جگ مگاتا رہا
نئی سَحر کا اجالا اسے بلاتا ہے[۲۷]

؎ جو رات بیت چلی اس کی بات کیوں چھیڑیں
سَحر قریب ہے ، آؤ ، سحر کی بات کریں[۲۸]

آزاد کشمیر کی اردو شاعری میں مقبول بٹ، سید علی گیلانی، برہان وانی اور یاسین ملک (جو ہنوز بھارت کی تہاڑ جیل میں پابند سلاسل ہیں) جیسے عظیم حریت راہ نما بھی جبر اور مزاحمت کی مؤثر آواز اور علامت سمجھے جاتے ہیں۔ مذکورہ راہ نماہوں کی ساری زندگی آزادی کشمیر کی خاطر جہدِ مسلسل سے عبارت ہے۔ انھوں نے تحریک آزادی کشمیر میں نہ صرف قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں بل کہ آزادی مانگنے کے جرم میں تختہ دار پر خوشی خوشی جھوم بھی گئے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں حق خود ارادیت مانگنے کی پاداش میں بھارت کی بدنام زمانہ ''تہاڑ جیل'' میں پابند سلاسل رکھا گیا۔ قائدِ حریت کشمیر مقبول بٹ کو اسی جیل میں مقید کر کے پھانسی بھی دی گئی اور بعد ازاں کشمیریوں کے مزاحمتی جذبے سے بچنے کے لیے اُن کا جسد خاکی اِسی جیل کے احاطے میں دفن کر دیا گیا۔ مقبول بٹ اہلِ کشمیر کی نظر میں مزاحمت کا روشن استعارہ اور علامت ہیں۔ اس بنا پر آزاد کشمیر کے مزاحمتی شعرا نے زبردست مزاحمتی لہجہ اپنا رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان شعرا کی نظم و غزل دونوں میں مقبول

بٹ شہید کی جہدِ مسلسل اور جرأت و بہادری کا اپنے اپنے اسلوب میں اظہار ہوا ہے۔ افتخار مغل کا بہ ذیل شعر اس حوالے سے قابلِ توجہ ہے۔

؎ کہ اِک زمانے سے سُونا ہے دار کا منظر
تہاڑ جیل پکارے کوئی نیا سورج[۲۹]

اسی طرح آزاد کشمیر کی اردو شاعری میں لہو، خون کے علاوہ مقتل، دار وغیرہ بھی جبر کی علامتیں ہیں۔ شعرا نے ان علامات کے ذریعے طالع آزما سیاسی قوتوں کی گرفت کی ہے۔ جب تحریک آزادی کشمیر اپنے زور پر ہوتی ہے تو یہی وادی بھارتی مظالم کی وجہ سے لہو رنگ کا منظر پیش کرتی ہے۔ اہلِ کشمیر کا ناحق خون بہانا بھارتی غاصبوں کا وتیرہ بن چکا ہے۔ آزادی کی تمنا لیے کشمیری خوشی سے اپنے خون کی قربانی پیش کر رہے ہیں۔ اسی بنا پر آزاد کشمیر کی اردو غزل میں ''بام و در''، ''منصور''، ''دار و رسن'' اور ''لہو'' وغیرہ جیسی جبر کی روشن علامتوں کے ذریعے سے، یہاں مزاحمت کی جھنکار سنائی دیتی ہے۔ اس نوعیت کی مزاحمت اور جبر کی علامات کے حامل بہ ذیل چند اشعار بہ طور مثال ملاحظہ ہوں۔

؎ حریت کے فسانے کی سرخی بنا
شاہ راہوں پہ ٹپکا جب بھی لہو[۳۰]

؎ فراز دار و رسن تک بھی ہم سفر ہوں گے
امینِ سنتِ منصور نام دار ہیں ہم[۳۱]

؎ لہو میں ایک نغمہ گونجتا ہے
نظر کسی کی نظر ہے سوچ لینا[۳۲]

؎ سوئے مقتل وہ لوگ آتے ہی
جو سرِ دار مسکراتے ہیں[۳۳]

قید و بند کا تذکرہ کرتے ہوئے نذیر انجم پکار اٹھتے ہیں کہ:

؎ موسمِ جبر و اختیار آیا
پھر پیامِ صلیب و دار آیا[۳۴]

یہ علامتیں سماج کے ان عناصر پر مشتمل ہیں جو جبر کی تصویر ہیں۔صابر آفاقی کی غزلیہ شاعری میں قدو قامت، مزاحمتی رنگ کا ایک بلیغ استعارہ اور علامت ہے۔اس کے علاوہ ان کی غزل میں آزادی کا جابہ جا خواب نظر آتا ہے۔یہ خواب بھی مزاحمت کی ایک علامت ہے۔مثال کے طور پر یہ ذیل شعر ملاحظہ ہو۔

ؔ آؤ اے ہم وطنو ایک بھی ہو کر دیکھیں
جھگڑا کشمیر کا ممکن ہے حل ہو جائے[۳۵]

ان علامات سے آزاد کشمیر کے شعرا نے رمزیت اور ایمائیت کے پردے میں مزاحمت کا اظہار کیا ہے۔یہاں کے شعرا کے ہاں مزاحمت یہ علامات مختلف معانی کے طور پر مستعمل ہیں۔کہیں ان علامات میں سماجی فسطائیت کو ہدف تنقید بنایا گیا ہے تو کہیں مقتدر قوتوں کے لیے علامات کو استعمال کیا گیا ہے۔

ریاستی جبر اور طالع آزما سیاسی قوتیں

تقسیمِ ہند کے واقعے کے ساتھ ہی ریاست جموں و کشمیر کی عوام پر ریاستی جبر کا نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔اس حوالے سے بھارتی حکومت کی طرف سے کئی قسم کے حربے اختیار کیے گئے، کئی خونی معرکے سرزد ہوئے، دھرتی کشمیر پر کئی بے گناہ مسلمانوں کو نہایت بے دری سے شہید کیا گیا۔طرح طرح کے ظلم روا رکھے گئے، جموں و کشمیر میں ہنوز ریاستی جبریت کا یہ سلسلہ جاری ہے۔تحریک آزادی کشمیر کی تاریخ میں کئی بار اہل کشمیر پر بدترین کرفیو نافذ کیا گیا۔جس میں جنوری ۱۹۹۰ء اور اگست ۲۰۱۹ء کا کرفیو زیادہ نمایاں ہے۔اول الذکر کرفیو کے دوران کشمیریوں نے اس پابندی کی خلاف ورزی کرتے ہوئے سینکڑوں کی تعداد میں سڑکوں پہ نکلے، ظلم و جبر برداشت کیا مگر بے جا پابندی گوارا نہیں کی۔

اسی بنا پر سری نگر شہر میں کرفیو کے نفاذ پر کشمیر کے شعرا بھی اہل کشمیر کے شانہ بشانہ احتجاج اور مزاحمت کی صدا بلند کرتے ہیں۔بھارتی مظالم کی ہر شکل جموں و کشمیر میں موجود رہی ہے۔بھارتی مظالم اور پابندیوں کی ایک شکل اگست ۲۰۱۹ء کو لگائے جانے والا طویل ترین کرفیو بھی ہے۔یہ کرفیو بھارت کی طرف سے ریاستی تشخص کے قانون (شق ۳۷۰۔اے) کو منسوخ کرنے کے موقعے پہ لگایا گیا۔تاکہ کشمیریوں کے ممکنہ ردعمل کو ظلم کی تلوار سے کچلا جاسکے۔گویا کشمیری حریت پسندوں کی مزاحمت کو روکنے کے لیے اس بدترین کرفیو میں نہتے کشمیریوں پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے گئے۔

اس خطے میں ریاستی جبر کی کوئی بھی صورت باقی نہیں رہی۔ بھاری تعداد میں بھارتی افواج کا اس خطے میں موجود ہونا، بھارت کی ریاستی دہشت گردی اور جبریت کی نمایاں مثال ہے۔ اس کے باوجود کشمیری تمام تر مظالم کے خلاف سینہ سپر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ معاشرے کے ایک حساس طبعیت کا مالک طبقہ یعنی شعرا و ادبا اس ظلم و ستم پر کیسے خاموش رہ سکتا ہے۔ بالخصوص کشمیر کے شعرا نے اس ظلم و جبر کی فضا میں اپنے قلم سے احتجاج اور مزاحمت کی متاثر کن شمع روشن کی ہیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر افتخار مغل جن کے رگ وپے میں کشمیریت اور حق خودآرادیت رچی بسی ہے، وہ ان مظالم اور ریاستی جبر کے ذمے داروں کو چیلنج کرتے ہوئے یوں مخاطب ہوتے ہیں:

ے حدودِ شہر پہ تو اختیار رکھتے ہو
دِلوں میں کرفیو نافذ کرو تو پھر جانیں[۳۶]

یہ کرفیو ریاستی جبر کی عکاسی کرتا ہے۔ کشمیریوں کے دلوں سے جذبہ آزادی کو مٹایا نہیں جاسکتا۔ بھارت ظلم واستبداد کا کوئی بھی حربہ استعمال کرلے مگر تاریخ شاہد ہے کہ کشمیریوں کے قلوب واذہان سے اپنی دھرتی ماں کی آزادی کی تڑپ برابر موجود رہی ہے۔ آزادی کا خواب یقین میں مبدل ہوتا چلا گیا۔ جبر کے ہر واقعے پر آزادی کی یہ تڑپ اور جذبہ مزید ابھرتا چلا گیا۔

افتخار مغل ریاستی جبر کے ذمے داروں کے خلاف زبردست مزاحمتی رویہ اپناتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ طالع آزما سیاسی قوتیں اور مقتدر اِدارے کشمیر میں بہنے والے خون کے ذمے دار ہیں۔ ان قاتلوں کو افتخار مغل نے بھرپور انداز میں للکارا ہے۔ وہ اس بات کا کھلم کھلا اظہار کرتے ہیں کہ یہ ہماری پاک دھرتی ہے، اس میں انصاف کی فصل بوئی جاتی ہے۔ اس میں بھارتی غاضبوں کو ظلمتیں بونے کی اجازت ہرگز نہیں دیں گے۔ کشمیر کی دھرتی پر اس ظلم و ستم کا بالآخر اختتام ہونا ہے۔ وہ اس بات پر بھی پختہ یقین رکھتے ہیں کہ اس دھرتی ماں پر معصوم کشمیریوں کے خون کی بے حرمتی نہیں ہونے دیں گے۔

افتخار مغل کی شاعری حریت پسندوں اور مجاہدین کشمیر کی آواز بنتی ہے جو ان کے حوصلے کو مزید تقویت بخشتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ آزادی پسند اور جدوجہد آزادی کے ضمن میں برسرِپیکار و عمل طبقے کے دلی جذبات کی غمازی کی ہے۔ یہاں کے شعرا کی فکر میں مزاحمت شامل ہے، اسی بنا پر بہ ذیل غزلیہ مصرعوں میں کشمیریوں کے قاتلو کو مخاطب کرتے ہوئے خبردار کیا ہے۔

ے نہیں اے قاتلو! دامن تمھیں دھونے نہیں دیں گے
ہم اپنے خون کی بے حرمتی ہونے نہیں دیں گے[۳۷]

ے یہاں ہم نے ستارے بوئے تھے، سورج اگائے تھے
کسی کو اس زمیں میں ظلمتیں بونے نہیں دیں گے[۳۸]

اسی طرح آزاد کشمیر کے ایک اور مزاحمتی شاعر نذیر انجم اپنی نظمیہ شاعری کی طرح غزلیہ شاعری میں بھی ریاستی جبر کا تذکرہ بڑی بے باکی سے کرتے ہیں۔ کہیں وہ استفہامیہ لہجہ اپناتے ہیں تو کہیں رجائی لہجہ برتتے ہیں۔ عالمی انصاف اور امن کے علم برداروں سے وہ سوال کرتے ہیں کہ کشمیر کی دھرتی پر خون برسنے کا موسم کیوں ختم نہیں ہو رہا؟ اس قدر ظلم و ستم کے باوجود آخر حشر کیوں نہیں اٹھتا؟ اس مسئلے پر عالمی عدالتیں انصاف کیوں نہیں کرتیں؟ یہاں غلامی کا حصار کب ٹوٹے گا۔ انصاف اور جمہوریت کے دعوے داروں کو آخر وادیِ کشمیر میں ظلم و ستم کے علاوہ خونی منظر کیوں دکھائی نہیں دیتا۔ نذیر انجمؔ کے ان استفسارات کی نشان دہی بہ ذیل شعر سے ہوتی ہے۔

ے جانے کیوں حشر ابھی تک نہیں اٹھا انجمؔ
کب سے خون بار ہے بیداد گری کا موسم[۳۹]

نذیر انجمؔ کے مذکورہ بالا شعر سے ان کے دل میں موجود کشمیر کی صورت حال کے سلسلے میں کرب اور تکلیف کو بہ خوبی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ گزشتہ نصف صدی سے کشمیر میں ہونے والے ریاستی جبر کو آزاد کشمیر کے شعرا نے اپنے اپنے رنگ اور اسلوب میں بیان کیا ہے۔ آزاد کشمیر کے دیگر شعرا کی نسبت مزاحمتی رحجان کے حامل شعرا کے ہاں اس جبر کے خلاف آواز زیادہ مؤثر اور توانا دکھائی دیتی ہے۔ نذیر انجم، افتخار مغل، رفیق بھٹی اور اسرار ایوب کی شاعری میں یہ مزاحمتی رنگ دیکھا جاسکتا ہے۔ رفیق بھٹی اپنی غزلیہ شاعری میں اس ریاستی جبر کا اعلان کچھ اس انداز سے کرتے ہیں۔

ے وہاں پہلے بہت سر کٹ چکے ہیں
جہاں میں سر اٹھانا چاہتا ہوں[۴۰]

اسی طرح افتخار مغل کی شاعری میں جبر کے اس راج کے اظہار کو واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔

ع شہر تاراج ہے ، جبر کا راج ہے[41]

مزید براں آزاد کشمیر کی غزل میں ریاستی جبر اور مزاحمتی مفاہیم کی حامل شعری مثالیں بہ ذیل ہیں:

؎ کتنی رنگین ہے درد کی تصویر
خون سے پُر ہیں ایاغ زخموں کے[42]

؎ محیط برسرِ مقتل ہے تیغ خوں آشام
بہ دستِ تیز ہٹاؤ، بڑا اندھیرا ہے[43]

؎ صدائے درد و الم ہے ستم زدہ کشمیر
لہو لہو ہے گلستان کلی کلی زنجیر[44]

وادیِ کشمیر جو سبزہ زاروں اور زعفرانوں کی سرزمیں ہے اس گلستانِ کشمیر کی کلی کلی اہلِ کشمیر کے خون سے رنگین ہے، خطہ کشمیر میں درد والم کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں، لیکن انصاف کے پرستاروں کو یہ درد بھری آواز سنائی نہیں دیتی۔

آزاد کشمیر کے شعرا کشمیر میں ہونے والے مظالم پر ریاستی اداروں کی بے اعتنائی سے بھی خائف نہیں ہیں۔ انھیں احساس ہے کہ یہ مقتدر حلقے اور ریاستی ادارے ہمارے مظالم کو دیکھ کر صرفِ نظر کر جاتے ہیں، اس حوالے سے اغیار کی ایما پر بے اعتنائی برتتے ہیں اور تحریکِ آزادی کشمیر میں عملاً حصہ لینے والوں سے منافقانہ رویہ اختیار کیا جاتا ہے۔ ایک طرف یہ ریاستی ادارے انھیں کہتے ہیں کہ ہم اس تحریک آزادی کی جدوجہد کی پشت پناہی کر رہے ہیں، جب کہ دوسری طرف یہی ادارے آزادی پسندوں کو جدِوجہد آزادی کشمیر اور ظلم کے خلاف پُرامن احتجاج کی پاداش میں حوالات کے سپرد کر دیتے ہیں۔ ان پہ جھوٹے مقدمات بنائے جاتے ہیں۔ یہ رویہ بالخصوص مقبوضہ وادی کے مقتدر حلقوں اور مطلق العنان ریاستی انتظامیہ کی طرف دیکھنے میں آتا ہے۔ اہل کشمیر اور آزادی کے متوالوں پر اس ریاستی ظلم و جبر کو نذیر انجم شعری قرینے میں یوں ڈھالتے ہیں۔

؎ کچھ ان کی بے اعتنائیوں نے خجل کیا ہے قدم قدم پر
کچھ اپنی سیماب گوں طبیعت سے بھی جہاں میں سبک ہوئے ہم[45]

آزاد کشمیر کی غزلیہ شاعری میں ریاستی مطلق العنان انتظامیہ کے آزادی پسندوں کے حوالے سے اپنائے گئے رویے سے بھی اہلِ کشمیر شکوہ کناں ہیں۔ اِن کو یہ احساس ہے کہ کشمیر کے دونوں اطراف ریاستی انتظامیہ پاکستان و بھارت کی پالیسیوں کے خلاف کچھ نہیں کر سکتی۔ ان کی ایما پر ریاستی جبر جیسے قابلِ گرفت عمل کی انجام دہی کی جاتی ہے۔ یعنی یہ ریاستی انتظامیہ اور حکومتی افراد خود بھی اپنے خطے کے لیے فیصلہ کرنے کے حوالے سے آزاد نہیں ہیں۔ اس بنا پر مقبوضہ کشمیر کی ریاستی انتظامیہ فرمانِ دہلی کے سامنے بے بس ہے اور اِس طرف آزاد کشمیر کی ریاستی انتظامیہ بھی فرمانِ اسلام آباد کے تابع ہے۔ ان سے کیا امید اور توقع رکھی جاسکتی ہے کہ یہ اہلِ کشمیر کو آزاد کروانے میں مدد و معاون ثابت ہوں گے۔ یہ خود دوسروں کے فرامین کے منتظر ہیں۔ اس رویے کی عکاسی بہ ذیل شعر سے ہوتی ہے۔

ہم اُس کی راہ پہ امیدوار بیٹھے ہیں
جو ایک عمر سے خود اپنے انتظار میں ہے[۴۶]

اہلِ کشمیر کو ان ریاستی اداروں سے جبر کی بابت سخت شکایت اس لیے رہی ہے کہ ان اداروں پر فائز افراد خود کشمیر کی سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن اقتدار میں آکر یہ جذبہ آزادی کشمیر اور جدوجہد آزادی کشمیر سے چشم پوشی کر جاتے ہیں۔ حالاں کہ یہ اپنے اپنے انتخابی حلقوں میں انتخابی مہم کے دوران میں بڑی بے باک اور بے بانگ دہل جدوجہد آزادی کشمیر اور کشمیر بنے گا پاکستان جیسے نعرے بلند کرتے ہیں۔ لیکن یہی اقتدار کے حصول کے بعد آزادی کشمیر کے بیس کیمپ (مظفر آباد) میں بیٹھ کر مجرمانہ غفلت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان کے اس عمل اور رویے پر شاعر نے مزاحمتی اظہار کیا ہے۔

کچھ اُس کے جبر کی بھی ہے شکایت
کچھ اپنی بے بسی کا بھی گلہ ہے[۴۷]

ریاستی جبر اور مطلق العنان انتظامیہ کے تحت مذکورہ بالا بحث سے پتا چلتا ہے کہ اس خطے کے افراد ہر طرح کی محکومی و مظلومی سے چھٹکارہ چاہتے ہیں۔ چاہیے یہ محکومی ریاستی طاقت ور افراد کی طرف سے ہو یا غیر ریاستی یعنی اغیار کی طرف سے ہو، اہلِ کشمیر سمیت یہاں کے مزاحمتی مزاج کے حامل شعرا دونوں طرح کی محکومی و جبریت کے خلاف سخت مزاحمتی رویہ اپنائے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

عالمی انصاف کے اداروں کے رویے

دنیا میں اس وقت مسلم آبادی کے کئی علاقے ظلم و ستم کی چکی میں پس رہے ہیں، جہاں بنیادی انسانی حقوق کی کھلم کھلا پامالی ہو رہی ہے، کشمیر جیسے خطوں میں ظلم و استبداد کی صدائے بلند ہو رہی ہیں۔ لیکن عالمی انصاف کے اداروں اور تنظیموں کو صدائے دردِ کشمیر سنائی نہیں دیتی۔ یہ نام نہاد بنیادی انسانی حقوق کی تنظیمیں اور ادارے ظلم کی اس آواز پر بہروں کا منظر پیش کرتے ہیں۔ کشمیر میں ریاستی جبر کے نتیجے میں عالمی طاقتوں کو ظالم کا ظلم نظر نہیں آتا اور نہ ہی اہل کشمیر کے درد کی شنوائی ہوتی ہے۔ اس قابض و ظالم کی طاقت و شنوائی نے اہلِ کشمیر کو بے حال کر رکھا ہے۔ نذیر انجم کو مذکورہ کیفیات کا بھرپور احساس ہے۔ گویا وہ پکار اٹھتے ہیں۔

؎ یہ بستی ہے ستم پروردگاں کی
یہاں ظالم کی شنوائی بہت ہے[۴۸]

؎ کمر خمیدہ رعایا کی بے بسی کے طفیل
جہاں پناہوں نے کی خدائیاں کیا کیا[۴۹]

مذکورہ بالا اشعار سے یہ بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اس کائنات میں ظالم کی شنوائی بھرپور ہے۔ علاوہ بریں کشمیر میں ہونے والے مظالم پر عالمی انصاف کے دعوے داروں کی خاموشی بھی بے نقاب ہوتی ہے۔ اقوام متحدہ کا ذیلی ادارہ سلامتی کونسل، جس نے مسئلہ کشمیر کے حوالے سے، حق خود ارادیت کی حمایت میں درجنوں قراردادیں منظور کی ہیں۔ لیکن لمحہ موجود تک یہ سلامتی کونسل ان قراردادوں پہ عمل در آمد کروانے میں ناکام رہا ہے۔ مسئلہ کشمیر کے تنازعے پر اقوام متحدہ کے عملی کردار سے گویا معلوم ہوتا ہے کہ یہ عالمی امن کے ادارے (اقوام عالم کی تنظیم) پر چند طاقت ور ریاستوں کو اجارہ داری حاصل ہے۔ ان طاقت ور ریاستوں (سُپر پاور) کی ایما پر دنیا کے کم زور انسانوں کو محکوم و آزاد کروانے کے فیصلے صادر کیے جاتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ نذیر انجم مسئلہ کشمیر پر اقوام متحدہ کے کردار کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ گزشتہ نصف صدی کے زائد عرصے سے اقوام متحدہ، جنوبی ایشیا کے اس سلگتے ہوئے مسئلے کو حل کروانے میں ناکام رہا ہے۔ حالاں کہ اس مسئلے کا حل استصواب رائے کی صورت میں بڑا ہی واضح اور آسان ہے۔ اقوام متحدہ کی قراردادیں بھی اسی بات کی غماز ہیں۔ کشمیریوں کے حق خود ارادیت کی حمایت میں منظور

ہونے والی ان قراردادوں پہ عمل در آمد کی صورت میں اس مسئلے کا پر امن حل نکل سکتا ہے۔ مگر اقوام متحدہ جیسے ادارے کی ساکھ کو کچھ اپنے ہی مفاد پرست افراد متاثر کر رہے ہیں۔ جس کی بنا پر اقوام متحدہ کا اس مسئلے پر کردار محض مجرمانہ معلوم ہوتا ہے۔

خطہ کشمیر میں جب بھی تحریکِ آزادی کشمیر زور پکڑتی ہے تو ان اداروں کے ایک اجلاس یا قرارداد کے ذریعے کشمیریوں کو خاموش کروا دیا جاتا ہے کہ ہم اس مسئلے کو اقوام متحدہ کی قراردادوں کی روشنی میں پر امن طریقے سے حل کر دیں گے۔ حالاں کہ یہ اقوامِ متحدہ کے ذیلی ادارے پچھلے کئی دہائیوں سے کشمیر کے مسئلے کے حوالے سے کیئے گئے وعدوں کی خلاف ورزی پر خاموش تماشائیوں کا کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں۔ کشمیر میں ہر نئے خونی، مزاحمتی اور بنیادی انسانی حقوق کی پامالی کے واقعے پر پاکستان سمیت عالمی دنیا میں عارضی طور پر آزادی کشمیر اور مسئلے کے حل کے حوالے سے بازگشت اور صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ طرح طرح کے مذمتی اور مزاحمتی بیانات داغے جاتے ہیں۔ مگر عملاً یہ بیانات اور صدائیں فقط صداؤں کی شکل میں تاریخ کا حصہ بن جاتی ہیں۔ پھر عالمی انصاف اور بنیادی انسانی حقوق کی دعوے دار سب تنظیمیں بھی چپ سادھ لیتی ہیں۔ ان اداروں کے اِس مجرمانہ رویے کو ہدف تنقید بناتے ہوئے نذیر انجم لکھتے ہیں۔

؎ گھٹائیں چھاتی ہیں لیکن برس نہیں پاتیں
صدائیں اٹھتی ہیں لیکن سُنی نہیں جاتیں[۵۰]

نذیر انجم اقوام متحدہ کے تغافل پر ایک اور جگہ پر یوں گویا ہوتے ہیں۔

؎ مجھے بھی تجھ سے شکایت رہی تغافل کی
یقین تجھ کو بھی آیا نہ میرے جذبوں کا[۵۱]

مزید براں آزاد کشمیر کے مزاحمتی شعرا ظلم واستبداد کی کیفیت میں خاموش رہنے کو سخت جرم قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ظالم کے ظلم کے خلاف آواز نہ اٹھانا، اہلِ قلم کی سب سے بڑی کوتاہی ہے۔ اسی بنا پر ان کی شاعری میں ظلم وستم کے خلاف مزاحمت کی بھرپور آواز بلند کرنے کی سعی نظر آتی ہے۔ یہ شعرا اس ظلم وجبر کے خلاف قلم کے ہتھیار سے جہاد کرنے کو بنیادی فرض سمجھتے ہیں۔ اس فن کو خوبی کے ساتھ جانتے بھی ہیں۔ انھوں نے اپنی قلم برادری کو بھی ظلم وستم پر اپنی خاموشی توڑنے اور مزاحمت کرنے پر، آمادہ کرنے کی اپنے تئیں بھرپور مساعی کی ہے۔ اس حوالے سے نذیر انجم کا بہ ذیل شعر قابل توجہ ہے۔

شبِ ستم میں خموشی بھی جرم ہے انجمؔ
سخن کے دیپ سرِ طاقِ لب جلائے جا[52]

متذکرہ بالا بحث کے تناظر میں یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ آزاد کشمیر کی اردو غزل میں ظلم و جبر کے خلاف ایک بھرپور آواز ملتی ہے۔ اس غزلیہ شاعری میں عالمی جبر سمیت ریاستی ظلم واستبداد کے خلاف کھلم کھلا قلمی جہاد دکھائی دیتا ہے۔ آزاد کشمیر کی غزل کے چند اشعار تو جدوجہد آزادی کشمیر کے نوجوانوں کے جذبہ آزادی کو بے پناہ وسعت بخشنے کا باعث بنتے ہیں۔ ان کو غلامی کی تاریک رات کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے پر یہ مزاحمتی غزلیہ شاعری آمادہ پیکار کرتی ہے۔ یہاں کی مزاحمتی رجحان کی حامل اردو غزل جبر کے ہر نظام کے خلاف بر سر پیکار معلوم ہوتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ فرزانہ ناز، پروفیسر، کشمیر، اردو ادب اور طنز و مزاح، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف کشمیر سٹڈیز (نکس)، میر پور، اکتوبر ۲۰۱۶ء، ص ۹۰۔۲۸۹

۲۔ رفیق بھٹی، ستون دار، پنجال پبلشرز، میر پور، ۱۹۹۴ء، ص ۱۳

۳۔ حبیب کیفوی، کشمیر میں اردو، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، ۱۹۷۹ء، ص ۲۵۰

۴۔ صابر آفاقی، ڈاکٹر، شہر تمنا، ادبیات پبلی کیشنز، مظفر آباد، ۱۹۸۰ء، ص ۶۹

۵۔ آمنہ بہار، چناروں کی آگ، علی پرنٹر، راول پنڈی، ۱۹۸۹ء، ص ۲۱

۶۔ صابر آفاقی، ڈاکٹر، شہر تمنا، ادبیات پبلی کیشنز، مظفر آباد، ۱۹۸۰ء، ص ۲۱

۷۔ نذیر انجم، قرضِ سخن (کلیات)، ارشد بک سیلرز، میر پور، ۲۰۱۱ء، ص ۵۹

۸۔ حبیب جالبؔ (فلیپ)، پلک پلک زنجیر، نذیر انجم، کاشر پبلشرز، میر پور، ۱۹۹۲ء

۹۔ افتخار مغل، ڈاکٹر، لہو لہو کشمیر، اجالا پبلی کیشنز، مظفر آباد، ۱۹۹۱ء، ص ۳۱

۱۰۔ نذیر انجم، پلک پلک زنجیر، کاشر پبلشرز، میر پور، ۱۹۹۲ء، ص ۱۵۹

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۶۵

۱۲۔ نذیر انجم، قرضِ سخن، ارشد بک سیلرز، میر پور، ۲۰۱۱ء، ص ۲۵۲

۱۳۔ افتخار مغل، ڈاکٹر، لہو لہو کشمیر، اجالا پبلی کیشنز، مظفر آباد، ۱۹۹۱ء، ص ۴۶

۱۴۔ ایضاً

۱۵۔ افتخار مغل، ڈاکٹر، انکشاف، اساطیر، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۲۱۶

۱۶۔ ایضاً، ص ۲۵۶

۱۷۔ صابر آفاقی، ڈاکٹر، سارے جہاں کا درد، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ۱۹

۱۸۔ نذیر انجم، قرضِ سخن، ارشد بک سیلرز، میر پور، ۲۰۱۱ء، ص ۵۳

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۲۱

۲۰۔ ایضاً، ص ۲۱۵

۲۱۔ افتخار مغل، ڈاکٹر، انکشاف، اساطیر، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۲۱۰

۲۲۔ نذیر انجم، قرضِ سخن، ارشد بک سیلرز، میر پور، ۲۰۱۱ء، ص ۱۷۹

۲۳۔ ایضاً، ص ۲۷۵

۲۴۔ ایضاً، ص ۱۷

۲۵۔ افتخار مغل، ڈاکٹر، انکشاف، اساطیر، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۱۲۰

۲۶۔ اکرم طاہر (غزل) مشمولہ مجلہ نوید صبح، علامہ اقبال گورنمنٹ ڈگری کالج، کوٹلی، آزاد جموں و کشمیر، ۱۹۸۶ء، ص ۱۸۱

۲۷۔ مشتاق شاد، ریگ ریگ، ماورا پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص ۱۰۳

۲۸۔ اکرم طاہر (غزل) مشمولہ مجلہ حسرت، چراغ حسن حسرتؔ گورنمنٹ ڈگری کالج، کھوئی رٹہ، آزاد جموں و کشمیر، ۱۹۹۱ء، ص ۱۱

۲۹۔ افتخار مغل، ڈاکٹر، انکشاف، اساطیر، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۱۵۳

۳۰۔ نذیر انجم، قرضِ سخن، ارشد بک سیلرز، میرپور، ۲۰۱۱ء، ص ۱۵۶

۳۱۔ نذیر انجم، پلک پلک زنجیر، کاشر پبلشرز، میرپور، ۱۹۹۲ء، ص ۶۷

۳۲۔ آمنہ بہار، سیدہ (غزل)، مشمولہ دومیل (مجلہ)، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج برائے طلبہ، مظفرآباد، آزاد جموں و کشمیر، ۲۰۱۴ء، ص ۱۱۱

۳۳۔ مخلص وجدانی، صلیبوں کا شہر، ادبیات، مظفرآباد، ۱۹۹۵ء، ص ۱۸

۳۴۔ نذیر انجم، پلک پلک زنجیر، کاشر پبلشرز، میرپور، ۱۹۹۲ء، ص ۵۴

۳۵۔ صابر آفاقی، ڈاکٹر، شہر تمنا، ادبیات پبلی کیشنز، مظفرآباد، ۱۹۸۰ء، ص ۱۶۰

۳۶۔ افتخار مغل، ڈاکٹر، لہو لہو کشمیر، اجالا پبلی کیشنز، مظفرآباد، ۱۹۹۱ء، ص ۳۱

۳۷۔ ایضاً، ص ۳۷

۳۸۔ ایضاً

۳۹۔ نذیر انجم، قرضِ سخن، ارشد بک سیلرز، میرپور، ۲۰۱۱ء، ص ۱۹۳

۴۰۔ رفیق بھٹی، ستون دار، پنجال پبلشرز، میرپور، ۱۹۹۴ء، ص ۴۵

۴۱۔ افتخار مغل، ڈاکٹر، لہو لہو کشمیر، اجالا پبلی کیشنز، مظفرآباد، ۱۹۹۱ء، ص ۱۲۷

۴۲۔ نذیر انجم، قرضِ سخن، ارشد بک سیلرز، میرپور، ۲۰۱۱ء، ص ۹۹

۴۳۔ افتخار مغل، ڈاکٹر، آزاد کشمیر میں اردو شاعری ، رُمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، راول پنڈی ، ۲۰۲۰ء، ص۱۵۵

۴۴۔ صابر آفاقی، ڈاکٹر، کشمیر میں اردو کی مزاحمتی شاعری (مضمون)، مشمولہ پاکستان میں اردو، جلد ۵، فتح محمد ملک (مرتب)، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۶ء، ص۳۳۱

۴۵۔ نذیر انجم، قرضِ سخن، ارشد بک سیلرز، میرپور، ۲۰۱۱ء، ص۱۵۰

۴۶۔ ایضاً، ص۲۴۶

۴۷۔ ایضاً، ص۲۴۹

۴۸۔ محمد صغیر خان، ڈاکٹر، نذیر انجم ـــــ لوحِ سخن کا حرفِ دائم (مضمون)، مشمولہ سیماب (مجلہ)، گورنمنٹ ڈگری کالج برائے طلبہ، افضل پور، میرپور آزاد کشمیر، ۲۰۱۵ء، ص۷۷

۴۹۔ ایضاً، ص۷۶

۵۰۔ نذیر انجم، قرضِ سخن، ارشد بک سیلرز، میرپور، ۲۰۱۱ء، ص۷۱

۵۱۔ ایضاً، ص۱۶۳

۵۲۔ ایضاً، ص۱۶۳

باب چہارم:

آزاد کشمیر کی دیگر اصنافِ شعر میں مزاحمتی عناصر

آزاد کشمیر کی اردو شاعری تمام اصناف سخن کے اعتبار سے ثروت مند ہے۔ اس آزاد خطے میں شاعری کی معروف اصناف نظم اور غزل کے علاوہ قطعہ، ہائیکو، گیت، ماہیا، ترانے، مثنوی وغیرہ کو فروغ حاصل ہوا۔ علاوہ ازیں ہیئت کے اعتبار سے نظم کی تمام اقسام میں یہاں شعری سرمایہ سامنے آیا مثلاً فرد، رباعی، مخمس، مسدس، پابند وآزاد نظم، نثری و معریٰ نظم وغیرہ۔ ان اصناف میں معیار اور مقدار کے لحاظ سے اچھا خاصا ادب تخلیق ہوا۔ ہنوز یہ روایت جاری وساری ہے۔ نظم اور غزل کی طرح قطعات، ترانوں، گیت اور مثنوی میں بھی مزاحمتی عناصر موجزن ہیں۔ خطۂ آزاد کشمیر کی اردو صنفِ شعر میں نظم و غزل کے بعد قطعات میں سب سے زیادہ مزاحمتی رویہ ملتا ہے۔ یہاں کی متذکرہ بالا اصنافِ شعر میں ظلم و جبر کے خلاف ایک مؤثر آواز پائی جاتی ہے۔

قِطعات میں مزاحمت

قطعہ اصناف سخن میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں قریباً ہر شاعر نے طبع آزمائی کی ہے۔ قطعہ عربی شاعری میں ایک مستقل صنف شعر تھی۔ یہ صنفِ شعر عربی سے فارسی اور پھر فارسی سے اردو میں مروج ہوئی۔ اسی طرح اردو کے ہر شاعر کی غزلیات، قصائد، سلاموں میں قطعہ بند کی مثالیں ملتی ہیں اور مستقل صنفِ شعر کی صورت میں بھی ملتے ہیں۔ قطعہ اپنی مخصوص ہیئت کے اعتبار سے غزل، قصیدہ اور رباعی سے مشابہت رکھتا ہے مگر ان سب اصناف میں بنیادی فرق پایا جاتا ہے۔ غزل اور قصیدے کے لیے مطلع کا ہونا لازم ہے۔ جب کہ رباعی کے لیے اوزان مختص ہیں۔ دو یا دو سے زائد مربوط اور مسلسل اشعار کا ایسا مجموعہ جس کے پہلے شعر میں مطلع نہ پایا جائے "قطعہ" کہلاتا ہے۔ الغرض قطعہ ایک ایسا ٹکڑا ہے جو دیگر اصناف شعر کا معاون و مددگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک منفرد صنف سخن بھی ہے۔

قِطعہ کے لغوی معانی "ٹکڑا یا جزو" کے ہیں۔ اردو کے مؤقر لغات میں اس کے لفظی معنی قریباً اسی مفہوم میں درج ہیں۔ جیسے فرہنگ آصفیہ کے مطابق "قطعہ اسم مذکر: ٹکڑا، پارہ، جزو، حصہ، بھاگ، پرزہ"۔[1]
اسی طرح فرہنگ تلفظ میں "قطعہ کس ق سک ط فت ع، ہ غم۔ آمد، ٹکڑا، حصہ، جزو، زمین کا کوئی ٹکڑا، دو بیتوں

کا مجموعہ، چند ہم قافیہ اشعار کا مجموعہ جو مسلسل اور ایک ہی موضوع پر ہوں۔"[2] معنی درج ہیں۔ اسی طرح مختصر اردو لغت میں بہ ذیل معنی درج ہیں:

> "قطعات: جمع قطعہ کی قطعہ مذکر: (۱) ٹکڑا، آراضی کا جزو، حصہ (۲) پرزہ، پرچہ (۳) دو بیتوں یا اس سے زیادہ ابیات جو مضمون کے اعتبار سے ایک دوسرے سے متعلق ہوں (۴) خوش نویسوں کا لکھا ہوا قطعہ"۔[3]

اصطلاح میں قطعے سے مراد دو یا دو سے زائد اشعار پر مشتمل ایک ایسے شعری اکائی کا نام ہے، جس کا مضمون ایک ہو۔ قطعے میں مطلع کی موجودگی ضروری نہیں۔ قطعے میں ہر شعر کے دوسرے مصرعے میں قافیے کی پابندی لازم ہے۔ گویا قطعے کی ہیئت قصیدے جیسی ہوتی ہے مگر قطعہ مطلع سے عاری ہوتا ہے، قطعہ ہر بحر میں کہا جاسکتا ہے۔ قطعے کے لیے اشعار کی کوئی قید نہیں البتہ قطعہ کم از کم دو اشعار پر مشتمل ہوتا ہے۔ پروفیسر انور جمال قطعے کی ہیئت کی بابت لکھتے ہیں:

> "اس کی ہیئت غزل کی ہوتی ہے۔ موضوعی اعتبار سے غزل کا ہر شعر انفرادی شان کا حامل ہوتا ہے تاہم کہیں کہیں درمیان میں دو یا زائد اشعار ایسے بھی آجاتے ہیں جن کا مضمون ایک شعر میں بیان ہونے کی بہ جائے زیادہ شعروں کا تقاضا کرتا ہے۔ یہ قطعہ ہے۔"[4]

قطعے کے لیے موضوع کی بھی کوئی قدغن نہیں۔ قطعہ نگار ہر طرح کے واقعات، بیانات، نظریات، خیالات، احساسات اور جذبات کو نظم کر سکتا ہے۔ البتہ سارا قطعہ معنوی اعتبار سے ایک مکمل اکائی کی حیثیت رکھتا ہو۔ اردو کی دیگر اصناف کی طرح قطعہ نگاری کی روایت کا آغاز بھی دکنی عہد سے ہوتا ہے۔ یہ ابتدائی دور تھا اس لیے اس دور میں قطعات کی تعداد بہت کم ہے۔ دکنی شعرا کے بعد شمالی ہند کے شعرا جن میں فائزؔ دہلوی ، جعفر زٹلی، فغاںؔ اور شاکرؔ شامل ہیں، نے اس روایت کو آگے بڑھایا۔ ان شعرا میں سے جعفر زٹلی کے قطعات اپنے عہد کی سیاسی ، اخلاقی اور سماجی برائیوں کے خلاف صدائے بغاوت بلند کرنے کی نشان دہی کرتے ہیں۔ اس کے بعد کلاسیکی شعرا کے قطعات میں تہنیتی اور تحسینی قطعات کو فروغ دیا۔ یہ سلسلہ ذوقؔ و غالبؔ کے دور سے ہوتا ہوا حالیؔ و شبلیؔ تک پہنچا۔ حالیؔ و شبلیؔ کے دور نے قطعات نگاری کو عروج بخشا۔ اس عہد میں سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی برائیوں کو قطعات کے ذریعے سامنے لایا گیا ہے۔

اسی طرح یہ روایت بیس ویں صدی تک پہنچی۔ قیام پاکستان کے بعد بھی اس روایت کو شعرا نے برقرار رکھا۔ دور جدید میں تو ہر مشاعرے میں اکثر شاعر اپنے کلام کا آغاز قطعے سے ہی کرتے ہیں۔ عہدِ حاضر میں انور مسعود، انور شعور اور ظفر اقبال جیسے شعرا قطعات نگاری کے ضمن میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ گویا اردو شاعری کے ہر عہد میں اکثر شعرا نے سیاسی، سماجی، معاشی، مزاحمتی، طنزیہ اور مزاحیہ نوعیت کے قطعات کہے۔

آزاد کشمیر کے شعرا نے بھی اسی شعری روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے اپنی شاعری کا معتد بہ حصہ قطعات نگاری کے لیے وقف کیا ہے۔ یہاں کے قطعات میں بھی سیاسی، سماجی، مزاحمتی، اخلاقی، عاشقانہ، طنزیہ، مزاحیہ اور قومی رنگ جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ یہاں کے زیادہ مزاحمتی رجحان کے حامل شعرا جن میں نذیر انجمؔ، افتخارؔ مغل اور رفیق بھٹی کے ہاں مزاحمتی مضامین کے قطعات دکھائی دیتے ہیں۔ بنابریں ان شعرا کے قطعات میں دیگر اخلاقی، سیاسی، سماجی، عاشقانہ، مزاحیہ وطنزیہ مضامین بھی موجود ہیں۔ نذیر انجمؔ کے قطعات عموماً چار مصرعوں پر مشتمل ہیں۔ قریباً اَسی (۸۰) سے زائد قطعات ان کے مجموعہ ہائے کلام میں موجود ہیں۔ انھوں نے نظم و غزل کی طرح قطعات کو بھی اپنے مخصوص مزاحمتی رویے کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔

نذیر انجم آزاد کشمیر کے خود مختار نظریے کے حامل شاعر ہیں۔ اس لیے دیگر اصناف شعر کی طرح قطعات میں بھی ان کے اس نظریے کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ پلک پلک زنجیر میں شامل ایک قطِعہ اُن کے سخت مزاحمتی رویے کی نشان دہی کرتا ہے۔

ظلم کو امن ، عداوت کو وفا کہتے ہیں ؎
کتنے ناداں ہیں صرصر کو صبا کہتے ہیں
میرے کشمیر! ذرا جاگ کہ کچھ جاہ طلب
غیر کو تیرے مقدر کا خدا کہتے ہیں[۵]

نذیر انجمؔ نے اِس قطعے میں خوب حقیقت وا کی ہے۔ عصرِ حاضر کے ایک طبقے کا یہی خیال ہے جو مذکورہ قطعے میں پوشیدہ ہے۔ کچھ ناعاقبت اندیش دانش ور کشمیر میں اس قدر ہونے والے جبر و تسلط کے باوجود خطے کو پُر امن قرار دے رہے ہیں۔ اسی طرح خطہ کشمیر کے دونوں اطراف موجود مطلق العنان انتظامیہ پاکستان و

بھارت کی طرف سے اختیار کی جانے والی پالیسیوں کو وفا سے تعبیر کرتے ہیں۔ نذیر انجم کے بہ قول یہ نادان طبقہ غلامی اور تسلط کی آندھی کو بھی آزادی کی پُر سکون ہوا سے مماثلت قرار دیتے ہیں۔

اس خطے پر مسلط طبقے کا ہمیشہ سے یہ خیال رہا ہے کہ یہ خطہ خود مختاری کی صورت میں اپنی بقا کو قائم نہیں رکھ سکتا۔ ان کے خیال میں کشمیر کی جغرافیائی صورت حال اس نوعیت کی ہے کہ اسے تینوں اطراف سے سرحدیں ایٹمی قوتوں سے ملتی ہیں، اس بنا پر ان قوتوں نے اسے گھیر رکھا ہے اور اس کی خود مختار صورت کو باقی نہیں رہنے دیا جائے گا۔ حالاں کہ یہ محض خام خیالی ہے، ریاست آزاد جموں و کشمیر رقبے، وسائل اور آبادی کے لحاظ سے خود مختار رہنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔ دنیا میں اس سے کئی گناہ کم وسائل، آبادی اور علاقے پر مشتمل آزاد اور خود مختار ریاستوں کی نظیر مل جاتی ہے۔ مگر اغیار کی ہمیشہ سے اس خطے کی سرزمین پر نگاہ رہی ہے۔ اس خطے کے وسائل پر ہر طاقت ور حکم ران کی نظر رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کشمیر تاریخ میں بھی سونے کی چڑیا ہونے کی وجہ سے کئی بار قتل و غارت کی آماج گاہ بنا، بڑے عرصے تک بیرونی طاقتوں کے زیر تسلط رہا۔ یہاں محکومی و غلامی کی کوئی نہ کوئی صورت ہمیشہ سے ڈیرے جمائے رہی ہے۔

اس وقت بھی پاکستان، بھارت اور چین کی کشمیر کی سرحد پر باہمی چپقلش کی بنیادی وجہ کشمیریوں کی آبادی پر قبضہ نہیں بل کہ ان کو یہاں کے قدرتی وسائل مطلوب و مقصود ہیں۔ ان قوتوں کی جانب سے یہاں کے اہل کشمیر اس وقت زیر عتاب آتے ہیں جب یہ اپنے قدرتی وسائل پہ قبضے کے خلاف مزاحم ہوتے ہیں۔ کشمیر کو اسی لیے بڑی بے دردی سے تقسیم کیا گیا ہے۔ لمحہ موجود تک ریاست جموں کشمیر کو، بھارت کے زیر انتظام "لداخ و جموں کشمیر ۴۹ فی صد علاقہ"، پاکستان کے زیر انتظام "آزاد کشمیر ۵ فی صد"، پاکستان کے زیر قبضہ "شمالی علاقہ جات (گلگت بلتستان) ۳۳ فی صد" اور چین کے زیر قبضہ "اقصائی چین ۱۳ فی صد علاقے" کی صورت میں تقسیم کیا گیا ہے۔ کشمیر کی اس جبری تقسیم کے خلاف نذیر انجم جیسے قوم پرست شعرا صدائے بغاوت بلند کرتے ہیں۔

نذیر انجمؔ ریاستی جبر کے خلاف بھی صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں جابہ جا ایسے اشعار مل جاتے ہیں جن میں وہ نہ صرف ریاستی جبر کا تذکرہ کرتے ہیں بل کہ وہ اس ریاستی جبریت کے خلاف مزاحمت کرتے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ نذیر انجم کو اپنی دھرتی ماں پر ہونے والے مظالم سخت کرب اور پریشانی سے دوچار کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک کشمیر کے دونوں اطراف سچ اور حق کی آواز کو ظلم کے ذریعے دبایا جا رہا

ہے۔ آزادی اظہارِ رائے پر مکمل قدغن ہے۔سچ پہ تعزیریں ہیں۔ریاستی انتظامیہ کی طرف سے جھوٹ اور منافقت اپنے عروج پر ہے۔اس گھمبیر صورت حال میں نذیر انجم جیسے محب کشمیر شاعر شکوہ کناں نظر آتے ہیں کہ اس ظلم و جبر کی شکایت کس سے کی جائے۔سب انصاف کے ذمے داروں اور احتساب کے دعوے داروں کو ریاست کشمیر میں ہونے والے ان مظالم کی آواز سنائی نہیں دیتی۔عالمی ادارے بھی اس موقعے پر بہروں کا سا کردار ادا کرتے نظر نہیں آتے ہیں۔نذیر انجم اس کرب اور درد کی کیفیت کو بہ ذیل قطعے کی مدد سے شعری قالب میں کچھ اس طرح زڈھالتے ہیں۔

ے طالع اہلِ کذب اوج پہ ہے
سچ پہ تعزیر ہے کٹہرے ہیں
شکوہ ظلم و جور کس سے کریں
سب ذوی الاحتساب بہرے ہیں[6]

اس قطعے سے واضح ہوتا ہے کہ سچ کے اظہار پہ سزائیں دی جاتی ہیں۔ان کو حوالات و عقوبت خانوں کے حوالے کیا جاتا ہے۔یہ ریاستی جبر کی واضح مثال ہے۔نذیر انجم بہ ذات خود کئی بار اسی سچ بولنے اور حق خود ارادیت کی آواز بلند کرنے کی پاداش میں پابندِ سلاسل ہوئے۔

کشمیریوں کو بھارت کی طرف سے کئی طرح کی سزائیں سہنی پڑتی ہیں۔کہیں انھیں اپنے ہی گھروں میں نظر بند کر دیا جاتا ہے اور کہیں انھیں جھوٹے مقدمات کے پیش نظر بھارت کے بدنام زمانہ تہاڑ جیل جیسے حوالات کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔پاکستانی حکم رانوں کی کشمیر سے متعلق پالیسی پر تنقید کرنے اور خود مختاری کے حق میں آواز بلند کرنے کی پاداش میں کچھ اسی سے ملتی جلتی صورت حال اِس طرف کے کشمیریوں کو بھی دیکھنی پڑتی ہے۔گویا اس طرح کشمیر میں اپنی مرضی سے سانس لینا بھی جُرم ٹھہرتا ہے۔

اس ظلم و ستم کی داستان بیان کرنے کی بھی اجازت نہیں ہوتی۔مقبوضہ کشمیر میں ایسی صورت حال میں انٹرنیٹ کی سہولت بھی معطل کر دی جاتی ہے۔بیرون دنیا سے تمام تر رابطوں کے ذرائع منقطع کر دیے جاتے ہیں۔اس طرح الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کے کسی بھی فرد کو حالات کا جائزہ لینے اور کشمیریوں کی فریاد کو سننے کی اجازت بھی نہیں ہوتی۔اس ظلم و ستم کی مکمل تصویر اگست ۲۰۱۹ء کو مقبوضہ کشمیر میں لگائے جانے والے کرفیو میں دیکھی جاسکتی ہے۔ایسے حالات میں اہلِ کشمیر کی نقل و حرکت پر تو پابندی لگائی جاسکتی ہے مگر

ان کی سوچ و فکر سمیت ان کے ذہنوں اور دلوں پر تو پابندی نہیں لگائی جاسکتی۔ وہ کشمیریوں کے درد کو بہ خوبی محسوس کرتے ہیں۔ نذیر انجم اس صورتِ حال کے پیش نظر پکار اٹھتے ہیں۔

ہر نفس دام ہے اسیری کا
کوئی صورت نہیں رہائی کی
سانس لینا بھی جرم ٹھہرا ہے
کب اجازت ہے لب کشائی کی[7]

مزید براں نذیر انجم اپنے قطعات میں ریاستی جبر پر بھی مزاحمتی رویے کا اظہار کرتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ آنے والے خوب صورت دنوں کا بھی مژدہ سناتے ہیں۔ گزشتہ کئی برس سے کشمیر میں حق خود ارادیت، سچ بولنے اور آزادی کے متوالوں کو ایک ہی قیمت چکانی پڑ رہی ہے۔ یہاں ظالم اور مظلوم عرصے سے ایک ہی ہیں۔ یعنی بھارت کی انتہا پسند قیادت اور ریاستی مطلق العنان انتظامیہ ظالم کی صورت میں اس خطے پہ ظلم و جبر کی علامت بنے ہوئے ہیں۔ گزشتہ نصف صدی سے اہلِ کشمیر بھارتی غلامی کی زنجیر میں گرفتار ہیں۔ اس حوالے سے بہ ذیل قطعہ قابلِ غور ہے۔

بشر ہے اب بھی اسیر طلسم عہدِ کہن
وہی ہے دام ، وہی صید ہے ، وہی صیاد
جنوں کی راہوں میں سجتی ہیں سولیاں اب بھی
فرد ہے آج بھی حیلۂ گر و ستم ایجاد[8]

اسی طرح نذیر انجم اپنے قطعات میں سماج میں موجود سماجی مسائل اور سماجی رویوں کے خلاف بھی زورِ قلم استعمال کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ غربت ہمارے ہاں امیر اور ثروت مند طبقوں کے منفی سماجی رویے کی دین ہے۔ اس وقت درجنوں کی تعداد میں ایسے خاندان موجود ہیں جن کا معیار زندگی بہت پست ہے۔ جب کہ دولت پر سرمایہ دار طبقے کی اجارہ داری قائم ہے۔ غریب کو اپنی محنت کا نہ صرف پورا پورا صلہ نہیں ملتا بل کہ اس غریب اور محنت کش طبقے کو سرمایہ دار افراد کے طعن و تشنیع کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے، سماج میں اس مغرور طبقے کی طرف سے غریب کو جس حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے وہ اس پہ مستزاد ہے۔ اس کے ساتھ انسانیت سوز سلوک بھی روا رکھا جاتا ہے۔ یہ غربا، امیروں کے احساسِ تفاخر کے بوجھ تلے دب کر رہ جاتے

ہیں۔ ہمارے سماج کے کئی خوب صورت چہرے غربت و افلاس کے غم سے مضمحل ہو جاتے ہیں۔ کچھ اسی طرح کی کیفیت بہ ذیل قطعے سے عیاں ہوتی ہے۔

ے دشتِ غربت میں آتشِ غم سے
جل رہے ہیں چنار جسموں کے
چبھ رہے ہیں دلوں میں کرب کے خار
مضمحل ہیں گلاب چہروں کے[۹]

نذیر انجم کے مذکورہ بالا زیرِ بحث قطعات سے ان کے مزاحمتی رویے کی جھنکار وا ہوتی ہے۔ اسی کے ساتھ ان کے دل میں اس مظلوم و محکوم طبقے کی بابت کرب کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔

افتخار مغل بھی اسی مزاحمتی رویت کے امین ہیں۔ ان کے قطعات تعداد کے اعتبار سے زیادہ نہیں مگر مقدار کی بہ جائے معیار پہ اترنے کے مصداق ہیں۔ ان کے قطعات میں بھی آزادی کشمیر کی تڑپ، شخصی آزادی، غاصبیت، ریاستی جبر، خطہ کشمیر میں بھارتی ظلم و بربریت، عالمی انصاف کے دعوے داروں کے دوغلے پن کے خلاف للکار، آزادیِ کشمیر کا عزم، صبح آزادی کی نوید جیسے موضوعات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ افتخار مغل کا صبح آزادی پر کامل یقین ہے۔ وہ اس بات کا بھی احساس رکھتے ہیں کہ کشمیر کی سرحدوں پہ اغیار کا قبضہ ہے لیکن فصیلِ شہر پر تو شہریوں کا اختیار ہے۔ آزادیِ سحر کی خوش خبری دیتے ہوئے افتخار مغل طویل شبِ خزاں کا ذکر کرتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کا بہ ذیل قطعہ خاصے کی چیز ہے۔

ے بڑی طویل تھی مانا ، شبِ خزاں ، لیکن
بہت قریب ہے صبحِ بہارِ آزادی
فصیلِ شہر پہ قبضہ ہے شہر والوں کا
"فصیلِ جاں پہ لکھو اشتہار آزادی"[۱۰]

کشمیر میں موت و حیات کے تناظر میں افتخار مغل زبردست حقیقت عیاں کرتے ہیں۔ اس خطہ کشمیر میں موت کی رسد، زیست کی طلب سے کئی گنا زیادہ ہے۔ اکثر و بیشتر کشمیری اپنی فطری موت کے برعکس قابض بھارتی افواج و اہلکاروں کے ظلم و ستم کا نشانہ بن کر حیاتِ جاوداں کا سامان بن جاتے ہیں۔ اس قدر ظلم

وبربریت کے باوجود کشمیری اپنی بقا کو آگے بڑھانے میں کام یاب نظر آرہے ہیں۔افتخار مغل اس حوالے سے ایک قطعے میں لکھتے ہیں۔

"واہمہ ہے طلسمِ موت و حیات
کب ہے معدوم کوئی، کب موجود
پھر بھی ہے موت کی رسد جاری
پھر بھی ہے زیست کی طلب موجود"[11]

اسی طرح افتخار مغل کشمیر کے مسئلے پر ضمیرِ عالم کو جھنجھوڑتے ہوئے کہتے ہیں کہ امن کے پرستارو،اِدھر بھی ایک نظر کیجیے۔اس خطے میں انسانیت کی اس قدر بے توقیری اور بے حرمتی کیوں ہے۔افتخار مغل چوں کہ عالمی منظر نامے پر گہری نظر رکھتے ہیں،اس لیے مسئلہ کشمیر پر عالمی طاقتوں اور اقوام متحدہ کی مجرمانہ غفلت و کردار کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔وہ انھیں کھلم کھلا للکارتے ہیں۔اقوام متحدہ کو کشمیر میں حرمتِ انسانیت پر اپنا مثبت کردار ادا کرنا چاہیے،اس مسئلے کے پائیدار اور دیرپا حل کے لیے اپنی قراردادوں پر عمل در آمد کروانا ہو گا۔وگرنہ اس خطے کو انسانیت کی تذلیل اور بد امنی سے کوئی نہیں بچا پائے گا۔حرمتِ انسانیت کو فروغ دینے کے یہ دعوے دار اہلِ کشمیر کی بے بسی اور محکومی پر کیوں خاموشی اختیار کیے ہوئے ہیں۔ انھیں بھارتی سفاکیت کا ذمے دار قرار دیتے ہیں۔افتخار مغل نے بہ ذیل قطعے کے ذریعے سے ضمیرِ عالم کو جھنجھوڑا ہے۔

"فروغِ حرمتِ انسانیت کے دعوے بجا!
چنار دیس کی نسبت پہ بے بسی کیوں ہے
اِدھر بھی ایک نظر، امن کے پرستارو
ہمارے باب میں آخر یہ بے حسی کیوں ہے"[12]

عالمی امن کے پرستاروں کو کشمیر میں ظلم،سفاکیت اور بد امنی نظر نہیں آتی کیوں کہ ان کے بھارت سے تجارتی مراسم ہیں۔ان کو احساس ہے کہ اگر اس مسئلے پر انصاف برتا گیا تو ہمارے ذاتی مفاد کو ٹھیس پہنچے گی،اس بنا پر عالمی دنیا نے مسئلہ کشمیر پر عملاً خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔

علاوہ ازیں افتخار مغل کے قطعات میں خطہ کشمیر کو ظلمات کے نشانات سے پاک کرنے کا عزم موجود ہے۔ اس خطہ ارضی کو ظلم و بربریت سمیت بھارتی سفاکیت سے پاک کرنے کا عزم لیے افتخار مغل آزادی کی درخشاں سحر کا پتا دیتے ہیں۔ اہلِ کشمیر کے لیے وہ اپنی شاعری میں "اہلِ عزم" کی ترکیب استعمال کرتے ہیں۔ انھیں احساس ہے کہ کشمیریوں کے اسی جواں خون سے آزادی کی سحر طلوع ہو گی۔ وہ اس پر کامل ایمان رکھتے ہیں۔ اُن کا یہ ذیل قطعہ اس بات کا پتا دیتا ہے کہ طویل جبر و مصائب کے راستے کے باوجود ابھی بھی کشمیری آزادی سے ناامید نہیں ہوئے۔

ے کبھی تو تیرگی سمٹے گی، نُور پھیلے گا
کبھی تو روشنی ظلمت سے معتبر ہو گی
اِسی کی کوکھ سے اُبھرے گا ایک دن سورج
شب دراز سہی ، آخرش سحر ہو گی[۱۳]

مزید براں اسی بنیاد پر فرہاد احمد فگارؔ اپنے تحقیقی مقالے میں رقم طراز ہیں:

"افتخار مغل کے کلام میں کشمیر بنیادی موضوع ہے، وہ اپنے وطن کا نوحہ بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس بات پہ بھی امید رکھتے ہیں کہ ضرور وہ دن آئے گا جب کشمیر دستِ غیر سے آزاد ہو گا۔" [۱۴]

محولہ بالا اقتباس سے اہل کشمیر کا آزادی پر ایمان و ایقان کو دیکھا جاسکتا ہے۔ افتخار مغل کے بعد آزاد کشمیر کے منظر نامے میں مزاحمتی شاعری کی روایت میں رفیق بھٹی اہم شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کا معتدبہ حصہ آزادی کشمیر پر مشتمل ہے۔ ان کی منظومات کی طرح قطعات میں بھی مزاحمت کا بھرپور رنگ جھلکتا ہے۔ رفیق بھٹی کے اکثر قطعات مزاحمتی رنگ لیے ہوئے ہیں۔ ان کے قطعات میں جذبہ آزادی کشمیر کے علاوہ مزاحمت کی مؤثر جھنکار سنائی دیتی ہے۔ رفیق بھٹی نے کشمیر کے تناظر میں عمدہ قطعات تخلیق کیے ہیں۔ ان قطعات میں وادیِ کشمیر کا حسن بھی ہے اور اس کی دل کشی کا ذکر بھی، اسی طرح ان میں ظلم و جبر کی بازگشت بھی ہے اور صبحِ آزادی کی نوید بھی، غرض ان کے قطعات تحریک آزادی کشمیر اور ریاست کشمیر کی مکمل تصویر ہیں۔

اسی طرح رفیق بھٹی کے قطعات میں ظلم و جبر کے خاتمے کی جابہ جا خوش خبری سنائی گئی ہے۔ تحریکِ آزادیِ کشمیر کی راہ میں جامِ شہادت پانے والے خوش نصیب مجاہدینِ کشمیر کے جذبہ شہادت اور ان قیمتی

قربانیوں کو سلامِ عقیدت بھی پیش کیا گیا ہے۔ رفیق بھٹی اس بات پر مضبوط ایمان و ایقان رکھتے ہیں کہ آنے والے ادوار میں اس خون کی نگری میں غلامی کی زنجیر ضرور ٹوٹے گی، اس زنجیر کے ٹوٹنے کی آواز انھیں سنائی دے رہی ہے۔ ان کے خیال میں تحریک حریت کام یابی کے قریب ہے۔ قندیلِ حریت یوں جھلملا رہی ہے جیسے یہ اک صبح آزادی کا پتا دے رہی ہو۔ رفیق بھٹی اپنی شاعری میں یہ ترغیب دے رہے ہیں کہ اس آزادی کے سفر میں جہاں کوئی رکاوٹ بنے، اس سے پوری شدت سے مزاحمت کریں۔ ان کے قطعات میں ظلم کی سرحدوں کو بنیاد سے مٹانے کا پختہ عزم موجود ہے۔

؎ جہاں جہاں بھی رکاوٹ بنے گی تاریکی
وہیں وہیں پہ لہو کے دیے جلائیں گے
یہی ہے عہد ہمارا وطن کی مِٹّی سے
فصیلِ ظُلم کو بنیاد سے مِٹائیں گے[۱۵]

رفیق بھٹی کشمیریوں کے اس جذبے کی بہ خوبی عکاسی کرتے ہیں، جس میں کشمیری اپنے وطن کی مِٹّی سے وفا کا عہد کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی شاعری میں اس بات کا اظہار ملتا ہے کہ وہ اپنے لہو سے دیے جلا کر ظلم کی فصیل کو مٹا دیں گے۔ مذکورہ بالا قطعے میں اس بات کا واضح اعلان کیا گیا ہے کہ آزادی کشمیر کی تکمیل تک یہ تحریکِ حریت جاری رہے گی۔ جو اس آزادی کی راہ میں رکاوٹ بنے گا، اس سے بھرپور مقابلہ کیا جائے گا۔ باالفاظ دیگر اس کے خلاف بھرپور مزاحمت کی جائے گی۔ اہلِ کشمیر متذکرہ نکات پر عمل بھی کر رہے ہیں۔ کشمیری مجاہدین اس جذبے سے تحریک حریت میں قدم رکھتے ہیں کہ وہ دشمن کے لیے موت کا پیغام ہیں۔ کشمیری تعداد میں کم ہونے اور بے سر و سامان ہونے کے باوجود بھارتی افواج کے سامنے سینہ سپر ہو کر دکھائی دیتے ہیں۔ جموں و کشمیر میں لاکھوں کی تعداد میں بھارتی افواج کا موجود ہونا، انھیں بہادر کشمیریوں سے ڈر اور خوف پر دلالت کرتا ہے۔ یہ کشمیریوں کی بہادری اور جرأت کا جذبہ ہے کہ تمام تر مظالم سہنے کے باوجود اپنے مشن ''آزادی'' پر ثابت قدمی سے ڈٹے ہوئے ہیں۔ اہلِ کشمیر کو یہ احساس ہے کہ:

؎ ہم ریت کی دیوار نہیں، کوہِ گراں ہیں
طوفان بھی آتے ہیں یہاں سر کو جھکا کے

دشمن کے لیے موت کا پیغام ہیں لیکن
دامان سکوں بخش ہیں یارانِ وفا کے[16]

کشمیریوں کے دلوں میں یہ جذبہ اور احساس بھی موجود ہے کہ مظلوم کی آہیں ظلم کے ایوانوں کو گرا کر رکھ دیتی ہیں۔ ان کو اس تصور پر کامل یقین ہے۔ اس لیے کشمیری کسی بھی طور شبِ تاریکی سے مایوس نہیں ہوتے۔ ان دل و دماغ میں یہی عناصر مزاحمت کے جذبے کو مزید تقویت بخشتے ہیں۔ یہ قانونِ فطرت ہے کہ چھوٹے چھوٹے ذرات اور ہلکی پھلکی موجیں مل کر طوفان بن جایا کرتی ہیں۔ یہی مثال اہلِ کشمیر کی ہے کہ یہ سب متحد ہو جائیں تو دشمن کے لیے ایک تکلیف دہ طوفان سے کم نہیں۔

اس وادی میں بھارتی مظالم کے پیشِ نظر رفیق بھٹی کو ہر سو لہو کی جھنکار سنائی دیتی ہے۔ وہ اس خطے کی ہر شے سے لہو کی بو محسوس کرتے ہیں۔ کشمیر کی ساری وادی میں لہو ہی لہو دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رفیق بھٹی اپنی شاعری میں خوب صورت اور دل کش وادیِ کشمیر کو "لہو نگر" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ان کے بہ ذیل قطعے میں "لہو" جو کہ جبر کی ایک علامت ہے، کو خوب صورتی سے برتا ہے۔

پتھر بھی لہو، پودے بھی لہو، دریا بھی لہو، دامن بھی لہو
آنسو بھی لہو، آہیں بھی لہو، دربن بھی لہو، درشن بھی لہو
کشمیر کی وادی وادی میں ہر سمت "لہو کی فصلیں" ہیں
میں لہو نگر کا فریادی، مرا تن بھی لہو، مرا من بھی لہو[17]

رفیق بھٹی کے قطعات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ وحدتِ کشمیر پر کسی پالیسی اور فیصلے کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ وحدتِ کشمیر کو اگر کسی نے متاثر کرنے کی سعی کی تو اہلِ کشمیر اس کے خلاف بھرپور طریقے سے مزاحم ہوں گے۔ خطہ کشمیر کو جس بے دری اور جبری طریقے سے تقسیم کر رکھا ہے، اہلِ کشمیر اسے سخت ناانصافی اور ظلم سمجھتے ہیں۔ کشمیری وحدتِ کشمیر یعنی ریاستی تشخص پر مر مٹنے کا جذبہ رکھتے ہیں۔ کشمیر کے دونوں اطراف اہلِ کشمیر اقوامِ متحدہ کو دیکھ رہے ہیں کہ وہ اپنی قراردادوں کے ذریعے اس مسئلے کا پرامن حل کریں گے۔ وگرنہ کشمیری اتنا جذبہ رکھتے ہیں کہ اپنے زورِ بازو پہ قابض اور غاصب طبقے کو ریاست بدر کر دیں۔ چوں کہ انھیں یقین ہے کہ اگر یہ سب باہم متحد ہو جائیں تو غلامی کے ہر ایک بند کو توڑ کے رکھ دیں گے۔ اسی طرح جبر وجور کے طوفان کو اپنی طاقت سے موڑ کے رکھ دیں گے۔ اہلِ کشمیر کے ہاں ابھی جذبہ

ایمانی اور جذبہ جہاد باقی ہے۔ کشمیر کے ٹکڑوں کو ایک بار پھر سے جوڑنے کا عزم لیے ہوئے کشمیری اس تحریک حریت اور تحریک مزاحمت میں کردار ادا کر رہے ہیں۔ اسی جذبے کا اظہار رفیق بھٹی بہ ذیل قطعے میں کرتے ہیں۔

ہر ایک بندِ غلامی کو توڑ دیں گے ہم
یہ جبر و جور کا طوفان موڑ دیں گے ہم
مرے وطن تری وحدت پہ جان بھی قرباں
ترے بٹے ہوئے حصّوں کو جوڑ دیں گے ہم[18]

کشمیر کا بچہ بچہ آزادی کشمیر کے محاذ پر مجاہد ہے۔ کشمیر کے ان مجاہدوں کو سوائے اللہ کے اور کسی قسم کا خوف نہیں ہے، نہ انھیں موت سے ڈر اور نہ شکست کا کوئی خوف ہے۔ ان باہمت مجاہدوں کو گولی، کلاشنکوف، بم یہاں تک کہ ایٹمی ہتھیاروں سے بھی کوئی ڈر و خوف نہیں۔ یہ اللہ کے بھروسے پر بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اللہ کے دین اور اپنے وطن کی خاطر اپنی جان کا نذرانہ بھی پیش کر دیتے ہیں لیکن اغیار کے سامنے جھکتے نہیں ہیں۔ کشمیر میں بھارت کو ان نہتے کشمیری مجاہدین سے خوف اور خطرہ ہے، تبھی کثیر تعداد میں مسلح افواج کشمیر میں داخل کر رکھی ہے۔ یہاں کشمیری بچے ڈنڈوں اور پتھروں سے ان کا مقابلے کرتے ہوئے بھی فخر محسوس کرتے ہیں اور اللہ اکبر کا نعرہ پورے جذبے سے بلند کرتے ہیں۔ جو تحریک حریت قائدین شروع کر گئے ہیں، یہ اب تا قیامت کچلنے والی نہیں۔ ایک نہ ایک دن بھارتی غاصبوں کو پسپائی ضرور نصیب ہو گی۔ بھارت کو ان کشمیریوں سے جو ڈر اور خوف ہے، اسے بہ ذیل قطعے میں دیکھا جا سکتا ہے۔

نہ اس کو خوف لڑنے کا ، نہ اس کو ہار کا ڈر ہے
کلاشنکوف کا، نہ ایٹمی ہتھیار کا ڈر ہے
اگر بھارت کو خطرہ ہے تو پھر اس بات کو مانو
شہیدوں کے لہو کا ، یا ''ستون دار'' کا ڈر ہے[19]

تحریک حریت کو ٹیپو سلطان کے اس قول پر یقین ہے کہ آزادی کا ایک لمحہ صدیاں جینے سے بہتر ہے۔ اس لیے کشمیر کے باشندے گزشتہ کئی دہائیوں سے اس محاذ پہ مسلسل بر سرپیکار ہیں۔ ان کی ساری زندگی جہدِ مسلسل سے عبارت ہے۔ رفیق بھٹی کے قطعات میں جا بہ کشمیریوں کی مزاحمت کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اسی

طرح کشمیریوں کو اپنی اصل منزل ''صبحِ آزادی'' کے قریب ہونے کا مژدہ سناتے ہوئے کہتے ہیں کہ آزادی کی محفل اب رنگ جمانے والی ہے۔

ے صبح کا تارا روشن ہو گا رات کی کالی چادر سے
بس دو چار قدم باقی ہیں منزل آنے والی ہے
خاکِ وطن کو خونِ جگر سے قدم قدم شاداب کرو
آزادی کی محفل اپنا رنگ جمانے والی ہے[۲۰]

رفیق بھٹی اپنی نظمیہ شاعری کی طرح قطعات میں بھی ریاستی جبر کا ذکر کرتے ہیں۔ اپنے وطن کو جب خون میں لت پت دیکھتے ہیں تو وہ شدید کرب اور درد محسوس کرتے ہیں۔ بھارتی غاصبوں کے اس جبر کے منظر کی تصدیق ان کے بہ ذیل قطعے کے ایک مصرعے سے ہوتی ہے۔

ع مری خاکِ وطن کے سارے منظر خوں چکیدہ ہیں[۲۱]

آخر میں آزاد کشمیر کے مزاحمتی شعرا کے کلام سے مزاحمتی رنگ اور مزاحمانہ اسلوب کے حامل قطعات بہ ذیل ملاحظہ ہو۔

ے جبر لفظوں کو مٹا دے تو صدا بولتی ہے
اتنا آسان نہیں ہونٹ کا سِلنا لوگو!
چار جانب سے عدو گھیرنے آئے گا تمھیں
اپنے قدموں سے کسی طور نہ ہِلنا لوگو[۲۲]

ے چمن کے حُسنِ تغّیر کا اعتبار کرو
سحر قریب ہے تھوڑا سا انتظار کرو
بہار رکتی نہیں ہے خزاں کی آندھی سے
سروں کے پھول نثارِ ستون دار کرو[۲۳]

ے دماغوں پہ پہرے بٹھائے ہیں تم نے
زبانوں پہ تالے لگائے ہیں تم نے

ہر ایک گام پر بے کسوں کے لہو سے
یہ زنداں، یہ مقتل سجائے ہیں تم نے[24]

سوادِ جنتِ ارضی! تیری قسم ہم کو
ترے وجود کو ظلمت سے پاک کر دیں گے
لہو کے دیپ لیے اہلِ عزم نکلے ہیں
قبائے تیرگی آخر کو چاک کر دیں گے[25]

آزاد کشمیر کے مزاحمتی شعرا کے مذکورہ بالا قطعات سے ان کے مزاحمتی رویے کو دیکھا جا سکتا ہے۔ قطعات کی اس بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ آزاد کشمیر کے شعرا نے قطعات کے ذریعے سے بھی مزاحمتی فکر کو پروان چڑھایا ہے۔ اس صنف کو بھی مزاحمتی رویے اجاگر کرنے کے لیے بھرپور طریقے سے استعمال کیا ہے۔ ان شعرا کے مزاحمانہ قطعات میں ظلم و استبداد کے خلاف متاثر کن آواز کارفرما ہے۔ یہ قطعات اپنے اندر اس قدر تاثیر رکھتے ہیں کہ یہ مزاحمانہ قطعات یہاں کے حریت فکر کے حامل افراد کی زبانوں پر رواں ہیں۔ یہاں کے شعرا نے قطعات میں ریاستی جبر، منفی سماجی اقدار کے خلاف آواز، عالمی و سیاسی جبر اور غاصبیت جیسے مزاحمتی عناصر کو اجاگر کیا ہے۔

ترانے میں مزاحمت

اردو شاعری میں ترانے کی اہمیت ہر عہد میں مسلم رہی ہے۔ ترانہ یا ملی نغمہ ایک ایسی صنفِ سخن ہے جس کا تعلق ملی یا قومی شاعری سے ہے۔ یہ صنف ہیئت کے اعتبار سے قصیدے، حمد، نعت، منقبت، مرثیہ، واسوخت اور شہر آشوب کی طرح ہر ہیئت میں لکھی جا سکتی ہے۔ جس طرح متذکرہ شعری اصناف موضوع کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں، اسی طرح ترانہ بھی موضوع کے اعتبار سے دیگر اصنافِ شعر سے علاحدہ حیثیت رکھتا ہے۔ جس شاعری میں وطن و قوم کی زبوں حالی اور تعریف و توصیف کا بیان ہو وہ ملی یا قومی شاعری کہلاتی ہے۔ اس صنفِ سخن میں نغمگیت، موسیقیت اور ترنم کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ باالفاظ دیگر ترنم اور نغمگیت ترانوں کا لازمی جزو ہے۔ اردو میں ان ترانوں یا وطنی شاعری کی حیثیت ہر عہد میں مسلم رہی ہے۔ تاریخِ شعر میں اس کے لیے قومی یا ملی گیت، رزمیہ، جنگ نامہ، حماسہ وغیرہ کے نام بھی مروج رہے

ہیں۔ اکثر شعرانے مخصوص ہیئت نہ ہونے کی وجہ سے اسے نظم کے ذیل میں برتا ہے۔ جب کہ موضوع کے لحاظ سے "ترانہ" اصنافِ سخن میں اپنی علاحدہ شناخت رکھتا ہے۔

اکثر شعرائے اردو نے کشمیر کی خوب صورتی، طلسمی سرزمین، اس کے سبزہ زاروں، برف پوش پہاڑوں، دل کش اور پُرکشش مقامات اور اس کے دل فریب نظاروں پر قلم اٹھایا ہے۔ اردو شاعری میں کشمیر کے حوالے سے کثیر تعداد میں ملی نغمے اور ترانے تخلیق ہوئے ہیں۔ اس ملی شاعری میں کہیں اس وادیِ کشمیر کے حسن و جمال کو موضوع بنایا گیا اور کہیں اس میں ہونے والے دشمنِ اسلام کے ظلم و جبر کی داستان سنائی گئی۔ تاریخ شاہد ہے کہ کشمیری بہادر و جاں باز عوام اس ظلم و جبر کے آگے آہنی دیوار بن کر کھڑی رہی اور ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے۔ قابض افواج سے اپنی جنتِ ارضی کی آزادی کے حصول کے لیے مسلسل جد و جہد کے عمل میں کوشاں دکھائی دیتی ہے۔ دنیا کی تاریخ میں اتنی طویل اور پُرخار جد و جہدِ آزادی کی مثالیں کم ہی ملتی ہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد کشمیر باقاعدہ اردو شاعری کا ایک اہم موضوع ٹھہرا۔ کشمیری اور غیر کشمیری شعرائے اردو کے کلام کا معتد بہ حصہ کشمیر کی بابت لکھا گیا۔ اکثر پاکستانی شعرانے کشمیر میں ہونے والے مظالم اور اس خطے کی دل کشی و رعنائی کے ضمن میں ترانے تخلیق کیے۔ اس حوالے سے خصوصاً فیض احمد فیضؔ، حبیب جالبؔ اور احمد فرازؔ جیسے پاکستانی مزاحمتی شعرانے اپنے ملی نغموں اور ترانوں کے ذریعے آمرانہ قوتوں، حاکموں اور غاصبوں کے خلاف قلم کے ہتھیار سے جہاد کیا۔

مزاحمتی شعری ادب کی اس روایت میں ہمارے آزاد کشمیر کے شعرا بھی پیچھے نہیں رہے۔ چوں کہ یہاں کے شعرا اس وادی میں ہونے والے ظلم و ستم کے چشم دید گواہ ہیں، اس پر زیادہ گہرائی سے خامہ فرسائی کر سکتے تھے، اس لیے انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے اپنے عہد کے جبر و استحصال کو شعری روایت کا حصہ بنایا۔ اس روایت کے ترانہ گو شعرا میں نذیر انجمؔ، رفیق بھٹیؔ، صابرؔ آفاقی، اسلمؔ راجا، منورؔ قریشی، افتخارؔ مغل، مشتاق شادؔ اور مقصودؔ بھٹی نمایاں ہیں۔

آزاد کشمیر کے معروف شعرا کے ترانوں میں نذیر انجم کے ترانے "ٹوٹے گی زنجیر"[۲۶]، "چھوٹے گا کشمیر"[۲۷]، افتخار مغل کے ترانے "کشمیر توجہ چاہتا ہے"، "دھرتی نے بلایا ہم کو"، "کشمیر ترے بیٹوں نے یہ عہد کیا ہے"، "لہو مانگتی ہے چناروں کی دھرتی"[۲۸] اور "میں اور میرا کشمیر"[۲۹]، مشتاق شادؔ کے ترانے "چلو کشمیر چلتے ہیں" اور "جلتا ہے کشمیر"[۳۰]، رفیق بھٹی کے ترانے "کشمیر ہمارا ہے"، "یہ زمیں چھوڑ دو یہ چمن چھوڑ دو"، "توڑو

یہ منحوس لکیر"[31]، "یہ ترا کشمیر ہے اور یہ مرا کشمیر ہے"، "ترانہ"، "ذرا کشمیر کو دیکھو"، "جنگ رہے گی جنگ رہے گی"، "میرے پیارے وطن"، "یہ میرا بھی کشمیر ہے"، "جاگ اٹھا کشمیر"، "وہ ستم دریدہ چمن کشمیر ہے"[32] اور "زنجیر ٹوٹنے کی آواز آرہی ہے"[33]، صابر آفاقی کے ترانے "آئین وطن"، "نویدِ بہار"، "ترانہ"، "ملی ترانہ" اور "جشنِ جمہور"[34] کے علاوہ عبدالعلیم صدیقی کا ترانہ "جاگ اٹھا کشمیر"[35] اور اسلم راجا کا ترانہ "میرا کشمیر"[36] قابلِ لحاظ ترانے شامل ہیں۔

مشتاق شاد کے ترانوں میں کشمیر سے گہری محبت کا اظہار ملتا ہے۔ ان کے ہاں آزادی کی سچی خواہش اور آزادیِ کشمیر پر مر مٹنے کا جذبہ موجزن ہے۔ اس کے علاوہ ان کے ترانوں میں کشمیر میں ہونے والے ظلم وجبر اور قتل وغارت کا ذکر بھی بڑی شدت کیا گیا ہے۔ بہ ذیل ان کے ترانوں سے بند ملاحظہ ہوں۔

اس پر جان لٹا سکتے ہیں
ہم سینوں پر کھا سکتے ہیں
دشمن کی شمشیر، ہمارا جلتا ہے کشمیر
جلتا ہے کشمیر ہمارا جلتا ہے کشمیر[37]

اسی طرح نذیر انجم بھی اپنی نظم وغزل کی طرح ترانوں میں بھی مزاحمتی رویے کا بھرپور اظہار کرتے ہیں۔ ان کی شاعری کا زیادہ تر حصہ اُس کشمیر میں ہونے والے ظلم وستم کے خلاف مزاحمت پر مشتمل ہے۔ ان کے ترانوں میں بھی یہی مزاحمتی لے برقرار ہے۔ ان میں بھی آزادی کے خواب سجائے اور غلامی کی شب کے خاتمے کا عزم لیے آزادی کی نوید سناتے ہوئے ایک ترانے میں لکھتے ہیں۔

ٹوٹے گی زنجیر
چھُوٹے گا کشمیر
مِٹ کے رہے گی سرحد کی یہ خونی سُرخ لکیر
مل کے رہے گی آخر اک دن خوابوں کی تعبیر
ٹوٹے گی زنجیر
چھُوٹے گا کشمیر
ظلم کے بادل چھَٹ جائیں گے بدلے گی تقدیر

ظُلمت کی یہ رات ڈھلے گی اُبھرے گی تنویر
ٹوٹے گی زنجیر
چُھوٹے گا کشمیر[۳۸]

افتخار مغل کی شاعری میں ترانے موجود ہیں۔ چوں کہ افتخار مغل کو کشمیر کے سیاسی مستقل کی فکر رہی۔ اس بنا پر ان کی شاعری میں ریاستی جبر سمیت اقوام متحدہ کی مسئلہ کشمیر کی بابت مجرمانہ پالیسی کا بھی گہرا احساس ہے۔ وہ اس دھرتی کو آزاد کروانے میں کسی بھی قربانی سے دریغ نہ کرنے کا عزم رکھتے ہیں۔ افتخار مغل کے ترانے سے ایک مزاحمانہ بند قابلِ غور ہے۔

؎ اٹھو کاخِ جبروت ویران کر دیں
اٹھو دہر کو پھر سے حیران کر دیں
چلو دیس پر جان کو دان کر دیں
جو ہے دسترس میں وہ قربان کر دیں

بلاتی ہے شاخساروں کی دھرتی
لہو مانگتی ہے چناروں کی دھرتی[۳۹]

اہلِ کشمیر مقبوضہ وادی کو ظلم و ستم سے آزاد کرنے کا بھرپور عزم رکھتے ہیں۔ اسی بنا پر یہ دشمن سے مسلسل برسرِپیکار ہیں۔ ان کی یہ جِدوجہد تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ افتخار مغل اپنی نظمیہ شاعری کی طرح ترانوں میں بھی خطہ کشمیر میں بنیادی انسانی حقوق کی پامالی پر سراپا احتجاج ہیں، اس ظلم کے خلاف کھل کر مزاحمت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ اپنے ایک ترانے میں مقبوضہ کشمیر میں ہونے والے بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی اور ظلم و جبر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

؎ ہر آنسو پر ہے پابندی ہر ایک زباں پر پہرے ہیں
ہونٹوں پہ قفل، نظروں پہ نظر، ہر ایک زباں پر پہرے ہیں
ہر بستی میں، ہر کوچے میں، ہر ایک مکاں پر پہرے ہیں
ہر اہلِ نظر پر قدغن ہے، ہر اہلِ زباں پر پہرے ہیں

اٹھو کہ ہمیں نے دھرتی کی گردن کو چھڑانے جانا ہے
دھرتی نے بلایا ہے ہم کو، دھرتی کو بچانے جانا ہے[۴۰]

مذکورہ بالا بند سے افتخار مغل کے ترانوں میں بھی مزاحمتی رنگ عیاں ہوتا ہے۔اسی روایت کے امین رفیق بھٹی نے اپنے وطن کے حوالے سے کثیر ترانے تخلیق کیے ہیں۔ان کے ترانوں میں جذبہ آزادی کشمیر، آزادی کی تڑپ، ظلم و جبر کا بیان اور ریاستی واغیار کے جبر کی داستان بدرجہ اتم موجود ہے۔وہ اپنے ترانوں میں کشمیر کے رہنے والوں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ کشمیریوں کے گرم لہو سے غلامی کی سرد برف پگھلنے والی ہے،کشمیر میں ظالم کی بربادی کا وقت قریب ہے،اس وادی کا بچہ بچہ آزادی کے لیے اٹھ کھڑا ہوا ہے۔رفیق بھٹی اپنے ترانوں میں کشمیریوں کو جوش وجذبہ دلاتے دکھائی دیتے ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ اب کشمیر سے بھارت کا تابوت جلد نکلنے والا ہے۔آزادی جیسی نعمت اب اہلِ کشمیر کو ملنے والی ہے۔کشمیر پر حکومت کرنے اور یہاں رہائش پذیر ہونے کا صرف اور صرف یہاں کے باشندوں کا حق ہے۔رفیق بھٹی ایک ترانے کے بہ ذیل بند میں کشمیر کے تقسیم شدہ ٹکڑے جوڑنے کا اعلان کرتے ہیں۔

بت اپنی غلامی کا، ہم توڑنے والے ہیں
طوفانِ حوادث کا، رخ موڑنے والے ہیں
کشمیر ترے ٹکڑے، ہم جوڑنے والے ہیں
وہ سامنے منزل ہے، نزدیک کنارا ہے
کشمیر ہمارا ہے، کشمیر ہمارا ہے[۴۱]

رفیق بھٹی اپنے ایک اور ترانے ''یہ زمیں چھوڑ دو، یہ چمن چھوڑ دو'' میں غاصبوں اور ظالموں کو علی الاعلان للکارتے ہیں۔جبر کے خاتمے کا مژدہ سناتے ہیں۔اسی طرح وہ حدمتارکہ (LOC) کو منحوس لکیر قرار دے کر اسے توڑنے کا مشورہ دیتے ہیں۔اہلِ کشمیر کے نزدیک اس خونی لکیر نے کشمیریوں کو بڑی بے دردی سے تقسیم کر کے رکھ دیا ہے۔اپنے ہی خطے میں آر پار جانے اور آنے سے یہ لکیر روکتی ہے۔یہاں خونی رشتے بھی اس منحوس اور خونی لکیر کھینچنے کی وجہ سے بٹ کر رہ گئے ہیں۔رفیق بھٹی اس خونی لکیر کو اپنے زور طاقت سے توڑنے اور عبور کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔اہل کشمیر کے نزدیک اس لکیر کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔دونوں اطراف کا علاقہ کشمیریوں کا ہے۔اگر نذیر انجم کے بہ قول یوں کہا جائے کہ ''کشمیر کا ذرہ ذرہ ہے کشمیر کے رہنے

والوں کا" تو بے جانہ ہو گا۔ اہلِ کشمیر وحدتِ کشمیر اور ریاستی تشخص پر کسی قیمت پر کوئی سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ وحدت کشمیر پر ان کا پختہ ایمان ہے۔ رفیق بھٹی کشمیریوں کے اس جذبے اور سوچ کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں کہ تقسیمِ کشمیر کسی صورت قبول نہیں ہے۔ یہاں یہ نکتہ مزاحمت کی بنیادی وجہ ہے۔

رفیق بھٹی کے سیاسی نظریے کے مطابق کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے۔ مقبوضہ کشمیر کو آزاد ہو کر ملک پاکستان سے الحاق ہونا ہے۔ یہ ان کا ایمان ہے، اقبال کے خوابوں کو تعبیر بخشنے کے لیے ہمیں آزادی کی جنگ لڑنی ہو گی۔ اس ضمن میں رفیق بھٹی اپنے ترانوں میں نوجوانو کو جدوجہد آزادی جاری رکھنے کی تلقین کرتے ہیں۔ پاؤں میں پڑی غلامی کی زنجیر کو توڑنے کی بات کرتے ہیں۔

باندھ کر سر سے کفن آؤ چلیں کشمیر کو
توڑ دیں اِک وار سے پاؤں پڑی زنجیر کو
اے جوانانِ وطن ارض وطن دل گیر ہے
یہ ترا کشمیر ہے اور یہ مرا کشمیر ہے
اِس کے پاؤں میں غلامی کی پڑی زنجیر ہے[۴۲]

اسی طرح رفیق بھٹی اپنے ترانوں کے ذریعے کشمیری قوم کے جذبے کو کوہ طور سے بھی بلند کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ وہ ان کے جذبہ آزادی کو خوب گرماتے ہیں۔ بھارت کے سیاست دانوں اور حکمرانوں کو نہایت جذبے للکارتے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک ترانے میں "چھین کر لیں گے آزادی" کی بے بانگِ دہل صدا بلند کرتے ہیں۔

بھارت کے سیاست کار سنیں　　جگ موہن کے غم خوار سنیں
دہلی کے در و دیوار سنیں　　کشمیر ہے اُن کی بربادی
ہم چھین کے لیں گے آزادی
ہم چھین کے لیں گے آزادی[۴۳]

رفیق بھٹی اس بات کا بھی پتا دیتے ہیں کہ جہاں فطرت کا ہر منظر شاداب ہوتا تھا، وہاں آج صبح و شام جبر و تشدد کے علاوہ یہاں بربریت اور اذیت ہی اذیت ہے۔ کشمیر شہیدوں کے لہو سے سرخ ہو چکی ہے۔ اس

وادی کشمیر میں آزادی پسندوں کا مسئلہ کشمیر بازوئے شمشیر کے استعمال سے حل ہونے کا عام اعلان ہے، کیوں کہ اقوامِ عالم اور اقوام متحدہ کا مسئلہ کشمیر پر مجرمانہ اور غفلت پرستانہ کردار ہے۔ آزادی پسندوں سمیت کشمیر کا بچہ بچہ اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ جب تک یہاں امن اور آزادی کا سورج طلوع نہیں ہوتا تب تک یہاں دشمن سے جنگ رہے گی۔ یہ بات رفیق بھٹی کے ترانوں میں خوب گونجتی ہے۔ رفیق بھٹی کے ترانے کے بہ ذیل دو بندوں میں اس کی واضح گونج سنائی دے رہی ہے۔

جب تک ہم آزاد نہ ہوں گے — وادی وادی شاد نہ ہوں گے
سب دشمن برباد نہ ہوں گے — یہ منزل گل رنگ رہے گی
جنگ رہے گی جنگ رہے گی
آزادی تک جنگ رہے گی

ہر غاصب شیطان سے کہہ دو — بھارت کے پردھان سے کہہ دو
جنتا کے بھگوان سے کہہ دو — تم پر دھرتی تنگ رہے گی
جنگ رہے گی جنگ رہے گی
آزادی تک جنگ رہے گی[۴۴]

ترانے کے مذکورہ بالا بندوں سے مزاحمت کی جھنکار کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ کشمیری آزادی کی صبح تک جنگ کرنے کو تیار ہیں۔ ریاست میں ہونے والے ظلم و جبر کے خلاف بھرپور مزاحمت ان کی زندگی کا لازمی حصہ بن چکی ہے۔ آزاد کشمیر کے شعرائے اردو کے ترانوں کے مطالعے سے بہ خوبی پتا چلتا ہے کہ انھوں نے جابرانہ اور استحصالی نظام کے خلاف نعرہ مستانہ بلند کیا ہے۔ انھوں نے اپنی مزاحمتی ترانوں کے ذریعے سے اپنے ہم وطنو کے ساتھ ساتھ عالمی دنیا کے ضمیر کو بھی جھنجھوڑا ہے۔ ان کی شاعری میں اہل وطن سے ہاتھوں کی بہ جائے دماغوں اور ذہنوں کو مسلح کرنے پر زور دیا ہے۔ ان کے ترانے آزادی و انقلاب کا محور ہیں۔ اس حوالے سے ان کے ترانوں میں بھرپور تاثیر موجود ہے جو اہل کشمیر سمیت قاری کو بھی نظام جبر کے خلاف مزاحمت کرنے پہ آمادہ پیکار کرتی ہے۔

مثنوی میں مزاحمت

مثنوی اردو شاعری کی معروف صنف ہے۔ مثنوی عربی زبان کے لفظ مثنیٰ سے ماخود ہے۔ جس کے معنی دو کے ہیں۔ اصطلاح میں مثنوی سے مراد ایسی مسلسل نظم جس کے ہر شعر میں دونوں مصرعے باہم مقفیٰ ہوں۔ اس کے تمام اشعار ایک ہی بحر میں ہوتے ہیں۔ سید صفی مرتضیٰ کے مطابق ''مثنوی۔۔۔ اصطلاح میں ان اشعار کو کہتے ہیں جن میں دو دو مصرعے آپس میں مقفیٰ ہوں''[۴۵] مثنوی میں ردیف اور قافیے کی شروع سے آخر تک پابندی لازم نہیں۔ البتہ ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ مثنوی کے لیے اشعار کی کوئی قید نہیں ہوتی، اسی لیے اردو شعری ادب میں سینکڑوں اشعار پر مشتمل مثنویاں بھی مل جاتی ہیں۔ مثنوی میں ہر طرح کے مضامین و خیالات بیان کیے جاسکتے ہیں۔ اس حوالے سے رفیع الدین ہاشمی لکھتے ہیں: ''مثنوی میں ہر طرح کے خیالات، واقعات اور مطالب ادا ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ بڑی مفید اور وسیع صنف شعر ہے۔''[۴۶] اردو شعری ادب میں مذہبی، اخلاقی، عاشقانہ، اور تاریخی وغیرہ جیسے موضوعات پر مثنویاں لکھی گئیں۔ مثنوی میں قدرتی مناظر، فطرت کی رعنائیاں، جنگوں کا بیان، سیاسی و سماجی واقعات، ظلم و جبر کی داستانیں، عشقیہ واقعات وغیرہ خوبی کے ساتھ نظم کیے جاتے ہیں۔

اردو شعری روایت میں کثرت سے مثنویاں لکھی گئیں۔ دکنی عہد میں کثیر تعداد میں مثنویاں سامنے آتی ہیں۔ مثلاً خاور نامہ، گلشن عشق، بوستانِ خیال، قطب مشتری، پھول بن وغیرہ اہم ہیں۔ اسی طرح بعد کے ادوار میں میر حسن اور دیا شنکر نسیم نے اس صنفِ شعر کو بام عروج بخشا، میر حسن کی مثنوی ''سحر البیان''، دیا شنکر نسیم کی مثنوی ''گلزار نسیم'' اور مرزا شوق کی مثنوی ''زہر عشق'' اردو کی لازوال مثنویاں ہیں۔ اردو کے دیگر شعرا کی کثیر تعداد نے اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ اس روایت کو حالی، جوش اور حفیظ جیسے شعرا نے جاری رکھا۔ اردو شعری تاریخ میں طویل مثنوی مروج رہی ہے لیکن عہد جدید میں مثنوی کی ہیئت میں مختصر نظمیں لکھی جارہی ہیں۔ اس روایت کی پاسداری میں آزاد کشمیر کے شعرا بھی شامل ہیں۔

آزاد کشمیر کے مزاحمتی شعرا جن کے ہاں مثنوی کی ہیئت میں نظمیں ملتی ہیں، ان میں نذیر انجم، رفیق بھٹی، افتخار مغل، صابر آفاقی اور مشتاق شاد نمایاں ہیں۔ ان شعرا نے نظم کی اس ہیئت میں بھی بھرپور مزاحمت کا اظہار کیا ہے۔ البتہ مثنوی کی ہیئت میں نظموں کی تعداد کم ہے۔ مثنوی کی ہیئت کی حامل منظومات میں نذیر انجم کی نظمیں ''مقبول بٹ''[۴۷] اور ''صبح آزادی''[۴۸]، رفیق بھٹی کی نظموں میں ''وہ ستم دیدہ چمن کشمیر ہے''[۴۹]،

"یہ میرا بھی کشمیر ہے"[50]، "ذرا کشمیر کو دیکھو"[51] اور "ماخوذ از، روداد قفس، سید علی گیلانی"[52] اور ڈاکٹر افتخار مغل کی نظموں میں "وطن"[53]، "شب خون"[54] اور جادہ شب میں اجالوں کا حوالہ تو تھا"[55] بہ طور خاص مزاحمتی رنگ کے ساتھ موجود ہیں۔

ان نظموں میں بھی مزاحمتی لے خوبی کے ساتھ موجود ہے۔ کشمیر میں ہونے والے مظالم کا بیان ان نظموں کا خاصا ہے۔ ریاست کشمیر میں بنیادی انسانی حقوق کی پامالی کے حوالے سے رفیق بھٹی کی مثنوی کی ہیئت کی حامل نظم سے بہ ذیل مصرعے ملاحظہ ہوں۔

ے

یہ کشت و خون، یہ جور و جفا، یہ ظلم و ستم
یہ قید و بند کا عالم ، بِساطِ رنج و الم
یہ سولیوں کے مناظر درندگی کے چلن
یہ دخترانِ وطن کے دریدہ پیراہن
قدم قدم پہ صلیبیں، نگر نگر میں جیل
بنامِ جامہ تلاشی یہ وحشیانہ کھیل[56]

اسی طرح رفیق بھٹی اپنی ایک اور مثنوی کی ہیئت میں لکھی نظم "میرا بھی کشمیر ہے" میں آزادی کشمیر پر اپنا تن من دھن قربان کرنے کا اعلان کرتے ہیں۔

ے

آزادی کی خاطر ہم تَن مَن اپنا واریں گے
اِس دھرتی کے ماتھے پر اِس کا روپ نِکھاریں گے
یہ دُنیا کی جنّت ہے اور غم کی تصویر ہے
یہ میرا بھی کشمیر ہے یہ تیرا بھی کشمیر ہے[57]

اسی طرح ڈاکٹر افتخار مغل اپنی ایک نظم میں ۲۷، اکتوبر ۱۹۴۸ء اس سیاہ رات کا ذکر کرتے ہیں جب بھارت غاصب نے کشمیر کی دھرتی پر اپنی ناپاک افواج کو داخل کیا ہے۔ اُس رات سے یہ دھرتی لہو نگر میں تبدیل ہے۔ کشمیری خونی بستی میں زندگی گزارنے پہ مجبور ہیں۔ اس حوالے ان کی ایک مختصر مثنوی کی ہیئت میں نظم "شب خون" سے بہ ذیل مصرعے بہ طور مثال ملاحظہ ہوں۔

وہ بھی اُس رات کا لمحہ تھا ، بھیانک لمحہ
جب سیاہ رات کا ایوان لرز اٹھا تھا
نیند کافور ہوئی، رات کا منظر بدلا
دیکھتے دیکھتے ہر آنکھ میں کاجل پھیلا
یک بہ یک شعلے اگلنے لگے توپوں کے دَھن
سبز ہو گیا زہر اب سے دھرتی کا بدن[58]

دیگر اصنافِ شعر کی طرح نظم کی اس ہیئت میں بھی شعرائے آزاد کشمیر نے مزاحمتی پہلوؤں کو عمدگی سے برتا ہے۔ متذکرہ بالا منظومات کے منتخب بندوں کی روشنی میں ہمیں اس خطے کی شاعری سے مزاحمتی عناصر سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ مثنوی کی اس ہیئت میں بھی یہاں کے شعرا نے مزاحمتی رویے کو خوبی کے ساتھ اجاگر کیا ہے۔اس لحاظ سے اس ہیئت میں قافیے کے التزام کی بنا پر مزاحمتی مضامین کی تاثیر میں بھی اضافہ ہوتا دکھائی دیتا ہے۔

ماہیے میں مزاحمت:

ماہیا شعری ادب میں ایک مقبول ترین صنفِ شعر ہے۔اردو کے علاوہ اس کو پنجابی اور سرائیکی شعری ادب میں کثرت سے استعمال کیا جاتا ہے۔اس کی جڑیں ہماری تہذیب و ثقافت کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں۔ایک لحاظ سے یہ لوک صنف ہے۔گیت کی طرح ماہیے میں بھی عام طور پر مضامین عورت کی زبانی بیان ہوتے چلے آرہے ہیں۔ماہیوں میں دراصل اُن تلخ اور کٹھن لمحات کا بیان سوزو گداز کے ساتھ کیا جاتا ہے جو سماج کے جبر اور مظالم کا نتیجہ ہوتا ہے۔ان تلخ لمحات کو ماہیے کی صورت میں تنہائی میں اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے۔اس صنف میں عورت کے ہجر و فراق کے قصے بھی ملتے ہیں اور محبت کی کہانی بھی نظر آتی ہے۔ماہیا کا لفظ ''ماہی'' سے ماخوذ ہے، جس کے معنی محبوب کے ہیں۔ابتدا میں ماہیے کا لفظ صرف محبوب کے لیے استعمال ہوتا تھا اور اس میں محبوب کے حوالے سے ہی دل کے معاملات کا بیان ہوتا رہا ہے۔مگر اب ماہیا ہر نوع کے موضوعات کے لیے مستعمل ہے۔اس میں اب ہر طرح کے جذبات کا بیان کیا جاتا ہے۔

ماہیا ہیئت کے اعتبار سے تین مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے۔بہ ظاہر یہ ہائیکو کے مماثل دکھائی دیتا ہے لیکن ماہیا ہائیکو سے الگ صنف شعر ہے۔ڈاکٹر سلیم اختر کے بہ موجب:''ماہیا تین مصرعوں پہ مشتمل ہوتا ہے

ہائیکو کی مانند لیکن ہائیکو سے مختلف ہے۔''[۵۹] اردو شعری ادب میں اس لحاظ سے اختر شیرانی اور چراغ حسن حسرت کو اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ان کے علاوہ اردو کے متعدد شعرانے اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔جن میں نصیر احمد ناصر، علی محمد فرشی، صابر آفاقی، بشریٰ رحمان، امین خیال، عاصی کاشمیری، آصف ثاقب، نذیر فتح پوری، عارف فرہاد، احمد حسین مجاہد، اختر رضا سلیمی، ایم یامین، منزہ اختر، الطاف قریشی، رفیق بھٹی، ڈاکٹر افتخار مغل اور صغیر آسی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

آزاد کشمیر کے شعری ادب میں ہمیں ''ماہیا'' قدیم اور مقبول ترین صنف شعر کے طور پر نظر آتا ہے۔ یہاں کے اردو ماہیوں میں چراغ حسن حسرت کے ماہیوں کو کلیدی اہمیت حاصل ہے۔ چراغ حسن حسرت کا تعلق آزاد کشمیر کے ضلع پونچھ سے ہے۔اس حوالے سے ڈاکٹر افتخار مغل اردو ماہیے کی تاریخ پر بحث کرتے ہوئے اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

> ''یہ بات دل چسپ ہے کہ اردو میں ماہیا نگاری کی ابتدا ہی آزاد کشمیر سے ہوئی ہے۔ یہ اعزاز آزاد کشمیر کے دورِ اول کے عظیم شاعر چراغ حسن حسرتؔ کو حاصل ہے۔جو آزاد کشمیر میں ہی نہیں بل کہ سارے برصغیر میں اردو ماہیا نگاری کے حوالے سے ایک اہم مقام اور اولیت کے حامل ہیں اور اردو میں ماہیا نگاری کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں۔''[۶۰]

مذکورہ بالا اقتباس سے ثابت ہوتا ہے کہ آزاد کشمیر کے شعرا کو اردو ماہیا نگاری کی صنف کو فروغ دینے میں کس قدر اپنا کردار ادا کیا ہے۔ گویا یہاں کے شعرا نے اردو ماہیا کو اپنے شعری اظہار کا وسیلہ بنایا۔ یہاں کے ماہیے میں مترنم جھیلوں اور جنگلی پھولوں سمیت سماجی مسائل کی جھلکیاں کثرت سے دکھائی دیتی ہیں۔ آزاد کشمیر کے دیہات میں اس صنف کو خوب برتا گیا۔ یہاں کے ماہیے کے حوالے سے یہ بات اہم ہے کہ آزاد کشمیر کے ماہیے میں موضوع، علامات اور مضامین کے لحاظ سے عہد بہ عہد تبدیلیاں ہوتی رہیں۔یہی وجہ ہے کہ یہاں کے ماہیے میں بھی مزاحمت کے مضامین در آئے۔

یہاں کے شعرا نے دیگر اصناف شعر کے طرح ماہیے کو بھی مزاحمتی رویے کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ آزاد کشمیر کے شعرا نے ریاستی مظالم کے بیان اور جبر کے خلاف اظہار کے لیے اس صنف کو بھی استعمال کیا ہے۔اس ضمن میں رفیق بھٹی کے چند ماہیے ملاحظہ ہوں۔

ڈل جھیل کا پانی ہے
اپنی غلامی کی
غم ناک کہانی ہے[۶۱]

جہلم کی روانی ہے
تیرتی لاشوں کی
دِل دوز کہانی ہے[۶۲]

آزاد کشمیر کے ان اردو ماہیوں سے عیاں ہوتا ہے کہ اس صنف میں بھی مزاحمت کی ہلکی لے موجود ہے۔ماہیے کے ترنم اور آہنگ کی بناپر اس مزاحمتی اظہار میں ایک خوب صورت تاثیر شامل ہو جاتی ہے۔مزید براں ماہیے کا یہ آہنگ مزاحمتی رنگ کو پُر معنی بنادیتا ہے۔جس کی وجہ سے یہ مزاحمتی مضامین مقبول اور زبان زدِعام و خاص ہو جاتے ہیں۔

آزاد کشمیر کی مزاحمتی شاعری کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ یہاں کے شعری ادب میں نظم و غزل کے علاوہ قطعات، ترانوں، مثنویوں اور ماہیوں میں مزاحمتی مضامین کی جھلک موجزن ہے۔یہاں کے شعرانے ان اصناف شعر کو مزاحمتی رویے کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔مزاحمتی رجحان کے حامل شعرانے اپنے قطعات کے ذریعے مقتدر اور صاحب اختیار کے مظالم کے خلاف بھرپور مزاحمتی رویہ اپنایا۔یوں یہ شعرا یہاں کے مظالم کے خلاف جنگ میں اہلِ کشمیر کی ایک پر تاثیر آواز بنتے دکھائی دیتے ہیں۔

یہاں کی مزاحمتی شاعری نے کشمیری قوم کے آزادی کے جذبوں کو خوب گرمایا ہے۔ آزادی کی خاطر اہل کشمیر کی جہد مسلسل میں آزاد کشمیر کے شعرا کا قلمی جہاد شامل حال ہے۔یہاں کی مزاحمتی شاعری میں اپنی آزادی کی تڑپ بھی موجود ہے اور ہر طرح کے جبر و تشدد کے خلاف مزاحمت بھی پائی جاتی ہے۔اس مزاحمت میں سیاسی و سماجی رویوں کے خلاف بھی بھرپور مزاحمتی آواز موجود ہے۔گویا اردو شاعری کی روایت کی پاسداری میں یہاں کی شاعری میں بھی بھرپور مزاحمتی مضامین اور مزاحمتی رویوں کا اظہار پایا جاتا ہے۔آزاد کشمیر کی مزاحمتی شعری ادب سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ان شعرا کے ملے جلے مزاحمتی اظہار نے یہاں کی

شاعری کو ایک خاص قدرِ مشترک بخشی ہے۔ یہ قدر جبر کے خلاف آواز اٹھانے کی ہے۔ یہاں کی شاعری میں کہیں سماجی رویوں اور منفی سماجی قدروں کے خلاف سلجھا ہوا مزاحمتی رویہ دکھائی دیتا ہے تو کہیں سماجی اقدار کی فسطائیت کے خلاف مزاحمت کو ایک سنبھلے ہوئے اسلوب میں دیکھا جاسکتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ مولوی سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ، جلد چہارم، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، اگست ۱۹۷۷ء، ص ۱۴۷۹

۲۔ شان الحق حقی (مرتب)، فرہنگ تلفظ، ادارہ فروغِ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء، ص ۷۴۵

۳۔ مختصر اُردو لغت، ترقی اُردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۷ء، ص ۱۴۷

۴۔ انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۱۵۰

۵۔ نذیر انجمؔ، پلک پلک زنجیر، کاشر پبلشرز، میرپور، ۱۹۹۲ء، ص ۱۴۴

۶۔ نذیر انجمؔ، قرضِ سخن، ارشد بک سیلرز، میرپور، ۲۰۱۱ء، ص ۱۷۴

۷۔ ایضاً، ص ۲۵۷

۸۔ نذیر انجمؔ، پلک پلک زنجیر، کاشر پبلشرز، میرپور، ۱۹۹۲ء، ص ۹۳

۹۔ ایضاً، ص ۱۲۲

۱۰۔ افتخار مغل، ڈاکٹر، لہو لہو کشمیر، اجالا پبلی کیشنز، مظفر آباد، ۱۹۹۱ء، ص ۶۶

۱۱۔ افتخار مغل، ڈاکٹر، انکشاف، اساطیر، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۱۱۱

۱۲۔ افتخار مغل، ڈاکٹر، لہو لہو کشمیر، اجالا پبلی کیشنز، مظفر آباد، ۱۹۹۱ء، ص ۶۲

۱۳۔ ایضاً، ص ۶۳

۱۴۔ فرہاد احمد، آزاد کشمیر کے منتخب غزل گو شعرا، مقالہ برائے ایم فل (اردو)، نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، اگست ۲۰۱۷ء، ص ۲۲۰-۲۱

۱۵۔ رفیق بھٹی، پروفیسر، لہو نگر، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، جنوری ۱۹۹۷ء، ص ۱۵۲

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۵۳

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۵۶

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۵۲

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۵۳

۲۰۔ رفیق بھٹی، ستون دار، پنجال پبلشرز، میرپور، آزاد کشمیر، جنوری ۱۹۹۴ء، ص ۸۷

۲۱۔ ایضاً، ص ۱۱۸

۲۲۔ اسرار ایوب، برف سے حرف، لیاقت پبلی کیشنز، میرپور، ۱۹۹۵ء، ص ۳۰
۲۳۔ رفیق بھٹی، ستون دار، پنجال پبلشرز، میرپور، آزاد کشمیر، جنوری ۱۹۹۴ء، ص ۴۵
۲۴۔ نذیر انجم، فرازِ دار، مجلسِ فکر و ادب، میرپور، آزاد کشمیر، ۱۹۷۰ء، ص ۳۸
۲۵۔ افتخار مغل، ڈاکٹر، لہو لہو کشمیر، اجالا پبلی کیشنز، مظفر آباد، ۱۹۹۱ء، ص ۶۳
۲۶۔ نذیر انجمؔ، قرضِ سخن، ارشد بک سیلرز، میرپور، ۲۰۱۱ء، ص ۲۵۴
۲۷۔ نذیر انجمؔ، چھوٹے گا کشمیر (ترانہ)، مشمولہ سروش (مجلہ)، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج، میرپور، آزاد کشمیر، ۱۷۔۲۰۱۶ء، ص ۴۶۵
۲۸۔ افتخار مغل، ڈاکٹر، لہو لہو کشمیر، اجالا پبلی کیشنز، مظفر آباد، ۱۹۹۱ء، ص ۲۱،۶۹،۸۴
۲۹۔ افتخار مغل، ڈاکٹر، انکشاف، اساطیر، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۱۱۶
۳۰۔ مشتاق شاد، نمبل، الحمد پبلشرز، میرپور، ۱۹۹۴ء، ص ۶۱، ۱۴۴
۳۱۔ رفیق بھٹی، پروفیسر، لہو نگر، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، جنوری ۱۹۹۷ء، ص ۷۵، ۱۰۱، ۱۰۹، ۱۱۳
۳۲۔ رفیق بھٹی، ستون دار، پنجال پبلشرز، میرپور، آزاد کشمیر، جنوری ۱۹۹۴ء، ص ۴۱، ۱۰۴، ۱۰۶، ۱۱۵، ۱۲۳، ۱۴۱، ۱۴۵
۳۳۔ رفیق بھٹی، زنجیر ٹوٹنے کی آواز آ رہی ہے (ترانہ)، مشمولہ سروش (مجلہ)، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج، میرپور، آزاد کشمیر، ۱۹۹۶ء، ص ۲۶۴
۳۴۔ صابر آفاقی، ڈاکٹر، شہر تمنا، ادبیات پبلی کیشنز، مظفر آباد، ۱۹۸۰ء، ص ۱۱۴، ۱۱۹، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۵۵
۳۵۔ عبد العلیم صدیقی، نہاں خانہ دل، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۱۶۰
۳۶۔ اسلم راجا، کونپل کا بدن، ادارہ مصارف کشمیر، میرپور، ۱۹۹۷ء، ص ۵۵
۳۷۔ مشتاق شاد، نمبل، الحمد پبلشرز، میرپور، ۱۹۹۴ء، ص ۱۴۵
۳۸۔ نذیر انجمؔ، چھُوٹے گا کشمیر (ترانہ)، مشمولہ سروش (مجلہ)، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج، میرپور، آزاد کشمیر، ۱۷۔۲۰۱۶ء، ص ۴۶۵
۳۹۔ افتخار مغل، ڈاکٹر، لہو لہو کشمیر، اجالا پبلی کیشنز، مظفر آباد، ۱۹۹۱ء، ص ۲۲۔
۴۰۔ ایضاً، ص ۱۷
۴۱۔ رفیق بھٹی، پروفیسر، لہو نگر، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، جنوری ۱۹۹۷ء، ص ۸۷

۴۲۔ رفیق بھٹی، ستون دار، پنجال پبلشرز، میرپور، آزاد کشمیر، جنوری ۱۹۹۴ء، ص ۴۳

۴۳۔ ایضاً، ص ۱۰۵

۴۴۔ ایضاً، ص ۱۱۶

۴۵۔ صفی مرتضیٰ، سید، اصناف ادب کا ارتقا، نسیم بک ڈپو، لکھنو، س ن، ص ۲۵

۴۶۔ رفیع الدین ہاشمی، اصناف ادب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۷۵

۴۷۔ نذیر انجمؔ، قرضِ سخن، ارشد بک سیلرز، میرپور، ۲۰۱۱ء، ص ۱۳۹

۴۸۔ ایضاً، ص ۶۹

۴۹۔ رفیق بھٹی، ستون دار، پنجال پبلشرز، میرپور، آزاد کشمیر، جنوری ۱۹۹۴ء، ص ۱۵۸

۵۰۔ ایضاً، ص ۱۴۱

۵۱۔ ایضاً، ص ۱۰۶

۵۲۔ رفیق بھٹی، پروفیسر، لہو نگر، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، جنوری ۱۹۹۷ء، ص ۶۸

۵۳۔ افتخار مغل، ڈاکٹر، لہو لہو کشمیر، اجالا پبلی کیشنز، مظفر آباد، ۱۹۹۱ء، ص ۲۴

۵۴۔ ایضاً، ص ۳۲

۵۵۔ ایضاً، ص ۴۱

۵۶۔ رفیق بھٹی، پروفیسر، لہو نگر، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، جنوری ۱۹۹۷ء، ص ۶۸

۵۷۔ رفیق بھٹی، ستون دار، پنجال پبلشرز، میرپور، آزاد کشمیر، جنوری ۱۹۹۴ء، ص ۱۴۲

۵۸۔ افتخار مغل، ڈاکٹر، لہو لہو کشمیر، اجالا پبلی کیشنز، مظفر آباد، ۱۹۹۱ء، ص ۴۱

۵۹۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، تنقیدی اصطلاحات (توضیحی لغت)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۲۳۲

۶۰۔ افتخار مغل، ڈاکٹر، آزاد کشمیر میں اردو شاعری، رُمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، راول پنڈی، ۲۰۲۰ء، ص ۴۲۲

۶۱۔ رفیق بھٹی، پروفیسر، لہو نگر، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، جنوری ۱۹۹۷ء، ص ۹۳

۶۲۔ ایضاً، ص ۹۴

ماحصل

مزاحمتی ادب کے سلسلے میں ہماری اردو ادب کی تاریخ کافی ثروت مند ہے۔ کوئی بھی عہد ایسا نہیں گزرا جب اہل قلم نے ارباب اختیار کے ظلم و ستم، جبر و تشدد، وحشت و بربریت، لوٹ کھسوٹ اور سازشوں کے پردے چاک نہ کیے ہوں۔ چوں کہ ادیب کا قلم اپنے سماج کا آئینہ دار ہوتا ہے، اس لیے وہ معاشرے کی ناہمواریوں، ظلم، جبر اور استحصال کے خلاف آواز بلند کرتا ہے۔ گویا ایک مزاحمتی شاعر ہمیشہ حالتِ جنگ میں رہتا ہے۔ مزاحمتی ادب ہر اُس معاشرے میں جنم لیتا ہے جہاں معاشرے کو ظالم اور مظلوم میں تقسیم کر رکھا ہوتا ہے۔

مزاحمت کے لفظی معانی روکنے کا عمل، روک ٹوک اور ممانعت کے ہیں۔ اصطلاح میں مزاحمتی ادب سے مراد ایسا ادب ہوتا ہے کہ جس میں کسی بھی ناانصافی، ظلم وجبر اور استحصالی نظام کے خلاف آواز بلند کی گئی ہو۔ مزید براں جبر واستحصال کی جتنی بھی صورتیں ہیں، ان کے خلاف قلمی جہاد کرنا مزاحمتی ادب کے دائرہ کار میں شامل ہے۔ دنیا میں قریباً ہر زبان میں مزاحمتی ادب تخلیق ہوا۔ اردو ادب کی روایت بھی اس حوالے سے خالی نہیں۔ اردو شاعری کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ اہلِ قلم نے ہمیشہ جبر و استحصالی قوتوں کے خلاف مزاحمت جاری رکھی۔ اردو ادب کی تاریخ میں نثری اصناف کے برعکس شاعری میں مزاحمت کی گھن گرج زیادہ مؤثر دکھائی دیتی ہے۔

اردو شاعری میں مزاحمت کی تاریخ خاصی پرانی ہے۔ جعفر زٹلی کو اردو کا پہلا باقاعدہ مزاحمتی شاعر مانا جاتا ہے۔ اس کے بعد کلاسیکی اور ایہام گو شعرا نے بھی اپنے اپنے عہد کے اخلاقی و سیاسی انحطاط اور سماجی برائیوں کے خلاف مزاحمت کی۔ اس کے علاوہ دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنؤ کے نام ور شعرا نے مزاحمت کی اس روایت کو آگے بڑھایا۔ اسی طرح قیام پاکستان کے بعد یہاں کی مخصوص سیاسی و سماجی فضا کی بدولت اردو میں مزاحمتی شاعری کو فروغ حاصل ہوا۔ جس میں حبیب جالبؔ، فیض احمد فیضؔ، جوش ملیح آبادی اور احمد فرازؔ جیسے مزاحمتی شعرا نے یہاں کی نامساعد سیاسی و آمرانہ صورت حال کے خلاف اپنے قلم کو استعمال کیا۔ آمریت کے ہر عہد میں ان شعرا نے مطلق العنان انتظامیہ کی طرف سے بنیادی انسانی حقوق کی پامالی کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ ان شعرا کی شاعری اپنے اپنے عہد کے جبر کے خلاف مزاحمت کی جان دار داستان معلوم ہوتی ہے۔

برِ عظیم پاک و ہند کے دیگر خطوں کی طرح خطۂ آزاد کشمیر میں بھی قابلِ توجہ شعری ادب تخلیق ہوا ہے۔ یہاں تقسیم ہند سے قبل بھی اور مابعد بھی شعرا کی بڑی تعداد موجود رہی ہے۔ یہاں بھی شاعری کی روایت کافی پرانی ہے۔ آزاد کشمیر کے معروف شعرا میں چراغ حسن حسرت، نذیر انجم، رفیق بھٹی، مشتاق شاد، شفیق راجا، احمد عطااللہ، آزر عسکری، الطاف قریشی، صابر آفاقی، افتخار مغل، مخلص وجدانی، زاہد کلیم، عبد العلیم صدیقی، ایم یامین اور جاوید الحسن جاوید وغیرہ شامل ہیں۔ آزاد کشمیر کے ان شعرا کے ہاں حالات حاضرہ پر گہری نظر، مزاحمت، حبِ رسول ﷺ، دھرتی ماں (کشمیر) سے محبت، آزادی کشمیر کی تڑپ، فطرتی مناظر سمیت سیاسی و معاشرتی زندگی پر عمیق نظر جیسے اہم موضوعات پائے جاتے ہیں۔

اردو شاعری میں مزاحمت کی جو روایت جعفر زٹلی سے شروع ہوئی تھی، وہ لمحہ تحریر تک جاری ہے۔ آزاد کشمیر کے شعرا بھی اسی روایت کے امین ہیں۔ جن میں نذیر انجم، افتخار مغل، صابر آفاقی، رفیق بھٹی اور اسرار ایوب زیادہ اہم مزاحمتی شعرا ہیں۔ انھوں نے جبر کی طاقتوں کے خلاف بھرپور مزاحمتی رویہ اختیار کیا۔ آزاد کشمیر کے مزاحمتی مزاج کے حامل شعرا غیر منصفانہ رویوں، مقتدر طبقوں کی من مانیوں اور مطلق العنان انتظامیہ کے غیر انسانی رویوں کے خلاف قلم سے تلوار چلانے کا گر خوب جانتے ہیں۔ تقسیم ہند سے لے کر لمحہ موجود تک ریاست کشمیر میں ظلم و جبر کی فضا اپنے نشیب و فراز کے ساتھ موجود رہی۔ خطہ کشمیر میں اسی اور نوے کی دہائی میں عسکری جدوجہد کے ساتھ مزاحمت کی لہر ایک بار پھر سے اٹھتی ہے۔ تو یہاں شعوری طور پر مزاحمتی شاعری کی تخلیق کا آغاز ہوا۔ اس عرصے سے لمحہ تحریر تک یہاں کے شعرا نے مزاحمتی رویے کو بھرپور طریقے سے شعری اظہار دیا۔ اس بنا پر آزاد کشمیر کے قریباً ہر شاعر نے مزاحمتی شاعری کی طرف توجہ دی۔ یہاں کے شعرا نے جہادِ کشمیر کے سلسلے میں اپنے قلم کے استعمال کو اپنا فرض سمجھا۔ جس کے نتیجے میں آزاد کشمیر کی شاعری میں مزاحمتی عناصر پوری شد و مد کے ساتھ در آئے۔

آزاد کشمیر کی اردو شاعری میں سب سے زیادہ مزاحمت کا اظہار نظم کے ذیل میں برتا گیا۔ یہاں کے شعرا نے کئی نظمیں جدوجہد آزادی کشمیر، ریاستی ظلم و جبر، غاصبیت اور طالع آزما سیاسی قوتوں کی جبریت کے پس منظر میں تخلیق کیں۔ چوں کہ کشمیر کی آزادی کا مسئلہ عرصہ دراز سے اقوام متحدہ کے ارباب اختیار کی مصلحت پسندی اور ظلمت دوستی کے باعث ایک رستا ہوا ناسور بنا ہوا ہے۔ اس لیے کشمیریوں کی جہدِ بقا کی ساری تاریخ مزاحمت سے بھرپور ہے۔ یہاں کی شاعری میں اپنی دھرتی ماں کی آزادی اور خود مختاری کی خاطر جبر

وظلم کے خلاف اہلِ کشمیر کے ساتھ ساتھ اہلِ قلم بھی علم بغاوت بلند کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں کی شعری روایت میں نذیر انجمؔ کی شاعری زیادہ مزاحمتی رجحان کی حامل نظر آتی ہے۔ نذیر انجم جبر کے عالمی و ریاستی اداروں کو للکارتے ہیں۔ ان کی نظموں میں کشمیریوں کے دکھ درد کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اس حوالے سے ان کی منظومات میں ''یاد آئے کشمیر بہت''، صبح بہارِ آزادی''، ''نوید سحر''، ٹوٹے گی زنجیر'' اور پیامِ انقلاب قابل توجہ ہیں۔

اسی طرح نذیر انجم کے بعد افتخار مغل کی نظمیہ شاعری میں مزاحمتی عناصر دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے ایک شعری مجموعے ''لہو لہو کشمیر'' کے نام سے ہی مزاحمتی رجحان کا پتا چلتا ہے۔ افتخار مغل کی نظموں میں وطن کی غلامی کا احساس خوب جھلکتا ہے۔ وہ بھی آزادی کشمیر کے پیام بر ہیں۔ وہ کشمیر کے مسئلے پر مقتدر طاقتوں کو ہدف تنقید بناتے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے اپنی نظمیہ شاعری میں اہلِ کشمیر پر ہونے والے مظالم کے خلاف مؤثر آواز بلند کی ہے۔ اس حوالے سے ان کی نظمیں ''شہدائے جموں کے حضور میں''، '' خاک وطن سے''، ''کشمیر توجہ چاہتا ہے'' اور ''مادر کشمیر'' کے نام گنوائے جاسکتے ہیں۔ اسی طرح دیگر قلم کاروں کی منظومات میں ''جلتا ہے کشمیر'' اور ''جلتا ہوا پل'' (آمنہ بہار)، ''کریں گے خاک وخوں آراستہ''، ''اب ہے آزادی کا جذبہ آسمانوں سے بلند'' اور ''ڈل کے پانیوں میں'' (مشتاق شاد) قابلِ ذکر ہیں۔

یہاں کے مزاحمتی شعرا کی نظموں میں نذیر انجم کی نظمیں '' دلائی کیمپ''، ''پیام انقلاب'' اور ''نوید سحر'' رفیق بھٹی کی نظمیں ''ہم چھین کے لیں گے آزادی''، '' اعلان آزادی''، اور '' منشور آزادی''، آمنہ بہار کی نظم ''جلتا ہوا پل''، ایم یامینؔ کی نظم ''اے روشنی کے شہید اول'' اور مشتاق شادؔ کی معروف نظم '' اب ہے آزادی کا جذبہ آسمانوں سے بلند'' اور ''ڈل کے پانیوں میں'' وغیرہ اپنے مضامین، ماحول، پس منظر اور مزاج کے اعتبار سے خاص مزاحمتی نوعیت کی ہیں۔

آزاد کشمیر کی نظمیہ شاعری میں ریاستی جبر اور طالع آزما سیاسی قوتوں کے خلاف بھی مزاحمت کی مؤثر لے سنائی دیتی ہے۔ اس حوالے سے افتخار مغل کی نظم ''ہوا قائل نہیں ہوتی''، پروفیسر رفیق بھٹی کی نظم ''شکوہ''، نذیر انجم کی نظم '' دلائی کیمپ'' اور توقیر گیلانی کی نظم ''عشاق'' ریاستی جبر کے پس منظر میں تخلیق کی گئیں۔ علاوہ ازیں مشتاق شاد کی نظموں میں بھی ریاستی جبر کی گھن گرج سنائی دیتی ہے۔ مزید براں یہاں کی نظموں میں عالمی ظلم واستبداد کے خلاف بھی آواز اٹھائی گئی ہے۔ مثال کے طور پر اقوام متحدہ کی کئی قراردادوں

کے باوجود یہاں ریاستی جبر کا سلسلہ جاری ہے۔اس پر عالمی طاقتیں اور انصاف کے ذمے دار خاموش دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں کے شعرا بالخصوص نذیر انجم اور افتخار مغل نے اپنی نظموں کے توسط سے عالمی طاقتوں کی اس خاموشی کے خلاف کھل کر مزاحمتی رویے کا اظہار کیا ہے۔

آزاد کشمیر کے مزاحمتی شعرا کی منظومات میں مزاحمت اور جبر کی علامتوں کو بھی برتا گیا ہے۔ جبر کی ان علامتوں میں تاج و تخت، دار ورسن، لہو، مقبول بٹ، سید علی گیلانی، مسندِ اقتدار، جہلم، نیلم، ہوا، زنجیر و رسن وغیرہ قابل توجہ ہیں۔ مثال کے طور پر افتخار مغل کی نظموں میں ''لہو'' حق کی خاطر مزاحمت کرنے کی ایک علامت ہے۔علاوہ ازیں یہاں کی اردو نظموں میں منفی سماجی رویوں کے خلاف بھی مزاحمتی رویہ اپنایا گیا ہے۔اس لحاظ سے آزر عسکری اور آمنہ بہار کی نظمیں بہ طور مثال دیکھی جاسکتی ہیں۔

نذیر انجم سمیت آزاد کشمیر کے مزاحمتی شعرا نے اپنی نظموں میں یہاں کی سیاسی و معاشی ابتری حالات کے باوجود، قوم کے حوصلے پائندہ رکھنے کے لیے اپنی ذمے داری کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ آزاد کشمیر کی مزاحمتی نظمیہ شاعری کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان شعرا کے ہاں تمام تر ظلم و جبر کے باوجود امید اور رجائیت کے مضامین بھی موجود ہیں۔

آزاد کشمیر کی اردو غزلیہ شاعری میں کشمیر کی آزادی و خود مختاری، اپنے وطن سے انسیت، کشمیر کی یاد سمیت کشمیر میں ہونے والے جبر کے خلاف آواز بلند کی گئی ہے۔ یہاں کی اردو غزل میں رمزیت اور ایمائیت کے باوجود جبر اور غاصبیت کے خلاف آواز متاثر کن ہے۔اس تناظر میں نذیر انجم کی غزل میں مزاحمت اور احتجاج کی لے سب سے توانا دکھائی دیتی ہے۔ ان کی غزلوں میں آزادی کی خواہش اور حسرت کو شدت سے محسوس کیا جاسکتا ہے۔ افتخار مغل سمیت دیگر مزاحمتی شعرا کی غزل میں بھی آزادی کی تڑپ، آزادی و خود مختاری پر غیر متزلزل ایمان نظر آتا ہے۔

یہاں کی اردو غزل میں گھٹن زدہ سماجی نظام کے خلاف بھی بھرپور آواز سننے کو ملتی ہے۔ نذیر انجم نے سماج کی مختلف منافقتوں اور ریاکاریوں پر سخت مزاحمتی رویہ اپنایا ہے۔اسی طرح دیگر شعرا میں آمنہ بہار، افتخار مغل اور مشتاق شاد کی اردو غزل میں سماجی برائیوں اور منفی سماجی اقدار کے خلاف بھرپور اظہار ملتا ہے۔ آزاد کشمیر کی نظمیہ شاعری کی طرح غزل میں بھی مزاحمت اور جبر کی علامات کا استعمال کیا گیا ہے۔ جس کی وجہ یہاں کا مخصوص سیاسی و سماجی ماحول ہے۔ مثلاً یہاں کی غزل میں ''ہوا'' جبر اور ریاکاری کی علامت ہے۔اسی

طرح ''تاریکی'' غلامی کی اور ''سحر'' آزادی کی علامتیں ہیں۔ علاوہ ازیں مقبول بٹ، برہان وانی اور یاسین ملک جیسے حریت راہ نما بھی مزاحمت کی علامات کے طور پر مستعمل ہیں۔ چوں کہ تقسیم ہند کے بعد سے خطہ کشمیر میں ریاستی جبر کا نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہے، اس لیے یہاں روز افزوں بنیادی انسانی حقوق کی پامالی ہوتی ہے، یہ ریاست کئی بار بدترین کرفیو کی لپیٹ میں رہی۔ یہاں کشمیریوں کو طرح طرح کی اذیتیں دی جاتی ہیں۔ متذکرہ اس ریاستی جبر کے خلاف آزاد کشمیر کی غزل میں احتجاج اور مزاحمت کی مدھم لے پائی جاتی ہے۔ یہاں کے شعرا نے ان مظالم اور ریاستی جبر کے ذمے داروں کو اپنی غزلیہ شاعری کے ذریعے سے ہدفِ تنقید بنایا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں کی اردو غزل میں عالمی انصاف کے اداروں کے سرد رویوں کے خلاف بھی مزاحمت کا اظہار پایا جاتا ہے۔

آزاد کشمیر کی غزل کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ یہاں کی غزل میں مزاحمتی رویے کا اظہار نظم کی نسبت زیادہ قدیم ہے۔ جو کہ آزاد کشمیر کے دورِ اول کے شاعر مرزا طالب گورگانی سے جاملتی ہے۔ نظم کے برعکس غزل کی ہیئت میں مزاحمت کی یہ آواز دھیمی ہی سہی مگر تاثیر سے بھرپور ہے۔ غزلیہ شاعری میں مزاحمت کی یہ آواز ہر طرح کے ظلم واستبداد کے خلاف بلند کی گئی۔ خواہ اس کا تعلق ریاستی جبر سے ہو یا سماجی ناانصافی سے، یہاں کی غزلیہ شاعری میں ظلم وجبر کا ہر ادارہ اور ہر ذمے دار قابلِ نفرین ٹھہرا۔ کہیں یہ ادارہ یہاں کی مطلق العنان حکومتیں ہیں تو کہیں ظلم کے خلاف اپنے ضمیر کی آواز بلند کرنے پر سماجی قدغن ہے۔

آزاد کشمیر کی اردو شاعری میں نظم و غزل کے علاوہ قطعات، ترانہ، مثنوی اور ماہیوں میں بھی مزاحمتی عناصر موجود ہیں۔ اس لحاظ سے یہاں کی نظم و غزل کے بعد قطعات اور ترانوں میں سب سے زیادہ مزاحمتی رویے کا اظہار ملتا ہے۔ یہاں کے قطعات میں نذیر انجم، افتخار مغل اور رفیق بھٹی کے قطعات مزاحمتی نوعیت کے ہیں۔ ان شعرا کے مزاحمتی رجحان کے حامل قطعات میں بھارتی سفاکیت، ریاستی جبر، سماجی مسائل اور سماجی رویوں کے خلاف آواز، غاصبیت، عالمی انصاف کے دعوے داروں کے دوغلے پن کے خلاف للکار جیسے مزاحمتی عناصر کارفرما ہیں۔

اسی طرح یہاں کے شعرا نے ترانوں میں بھی اپنے عہد کے جبر واستحصال کو مزاحمتی شعری روایت کا حصہ بنایا ہے۔ یہاں کے ترانہ گو شعرا میں نذیر انجم، افتخار مغل، مشتاق شاد، رفیق بھٹی، صابر آفاقی کے علاوہ

عبد العلیم صدیقی قابل ذکر ہیں۔ ان شعرا کے ترانوں میں ظلم و ستم کے خلاف مزاحمت، ریاستی تشخص، ظلم وبربریت، آزادی کشمیر کے خواب اور شبِ غلامی کے خاتمے کا عزم جیسے عناصر پائے جاتے ہیں۔

مزید براں آزاد کشمیر کی اردو شاعری میں مثنوی کی ہیئت میں لکھی گئی شاعری میں بھی مزاحمتی رویوں کو فروغ دیا گیا ہے۔ مثنوی کی ہیئت کی حامل نظموں میں مقبول بٹ از نذیر انجم، وطن اور شبِ خون از افتخار مغل، وہ ستم دیدہ چمن کشمیر ہے از رفیق بھٹی مزاحمتی لہجے کی غماز ہیں۔ کشمیر میں ہونے والے مظالم کا بیان ان منظومات کا خاصا ہے۔ علاوہ ازیں آزاد کشمیر کے اردو ماہیے میں بھی مزاحمت کی لے موجزن ہے۔ ماہیے میں قافیے کے التزام، ترنم اور مخصوص آہنگ کے باعث مزاحمت کی تاثیر میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

نتائج

زیر تحقیق مقالے سے یہ نتائج سامنے آتے ہیں کہ کسی بھی قسم کے جبر کے خلاف قلمی جہاد کرنا مزاحمتی ادب میں شمار ہوتا ہے۔ جس شاعری میں جبر واستبداد کی کسی بھی صورت کے خلاف آواز بلند کی گئی ہو وہ مزاحمتی شاعری کہلاتی ہے۔ مزید براں آزاد کشمیر کی اردو شاعری میں مزاحمت کی ایک توانا اور مؤثر آواز موجود ہے۔

یہاں کی اردو نظم میں مقدار کے لحاظ سے زیادہ مزاحمتی اظہار کو فروغ حاصل ہوا، جس کی بنیادی وجہ نظم کا موضوعاتی تسلسل اور وسعت ہے۔ علاوہ ازیں یہاں کی نظم میں غزل کی بہ نسبت مزاحمتی رویہ واضح اور نمایاں معلوم ہوتا ہے۔ مزاحمتی لہجے اور مزاحمتی موضوعات کے پس منظر میں یہاں کئی کئی نظمیں تخلیق کی گئیں۔ آزاد کشمیر کی اردو نظم میں آزادی وخود مختاری کی سعی، ریاستی جبر، طالع آزما سیاسی قوتوں اور عالمی ظلم واستبداد کے ذمے داروں کے خلاف للکار، جبر کی علامتیں اور سماجی رویوں کے خلاف مزاحمت جیسے نمایاں مزاحمتی عناصر موجود ہیں۔

نظم کی نسبت اردو غزل میں مزاحمت کی روایت کافی پرانی ہے۔ غزل کی رمزیت اور ایمائیت کے بہ وصف یہاں کی غزل میں مزاحمتی عناصر زیادہ قدیم ہیں۔ دوران تحقیق یہ بات شدت سے محسوس کی گئی کہ شعرائے آزاد کشمیر کے ہاں اہلِ کشمیر اور اپنے وطن کے لیے بے پناہ محبت اور لگاؤ پایا جاتا ہے۔ یہاں کی مزاحمتی شاعری میں کشمیر میں روا رکھے جانے والے ظلم واستبداد کے خلاف مزاحمت، مطلق العنان ریاستی انتظامیہ کا ریاستی جبر کے خلاف مزاحمت، سماجی رویوں کے خلاف مزاحمت اور غاصبیت اور سیاسی جبریت جیسے

اہم مزاحمتی عناصر پائے جاتے ہیں۔ یہاں کی نظم و غزل دونوں میں مزاحمت اور جبر کی کچھ علامات کو بھی برتا گیا ہے۔ آزاد کشمیر کی دیگر اصناف جیسے قطعات میں بھارتی سفاکیت، ریاستی جبر اور آزادی کے لیے تڑپ جیسے عناصر پائے جاتے ہیں۔ترانوں میں آزادی کشمیر کے خواب اور شب غلامی کے خاتمے کا عزم پایا جاتا ہے۔ مثنوی اور ہائیکو میں غزل کی طرح مزاحمت کم ہے۔زیر بحث تحقیق آزاد کشمیر کی اردو شاعری میں مزاحمتی عناصر کو سمجھنے میں مدد و معاون ثابت ہو گی۔

سفارشات

زیر نظر تحقیق اور مذکورہ بالا ابواب میں کی گئی بحث اور نتائج کی روشنی میں یہ ذیل سفارشات کی جاتی ہیں۔

۱۔زیر نظر تحقیق آزاد کشمیر کی اردو شاعری میں مزاحمتی عناصر کے تجزیاتی مطالعے پر مشتمل ہے۔اس میں زیادہ مزاحمتی رجحان کے حامل شعرا کی شاعری کو زیر بحث لایا گیا ہے۔اسی طرح آزاد کشمیر کی اردو نثر کا بھی مزاحمت کے تناظر میں مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ آزاد کشمیر کی اردو مزاحمتی شاعری کا مقبوضہ کشمیر کی اردو مزاحمتی شاعری سے تقابل بھی کیا سکتا ہے۔علاوہ ازیں یہاں کی مزاحمتی شاعری کا گلگت بلتستان کی مزاحمتی شاعری کے ساتھ تقابل کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ آزاد کشمیر کے اردو شعری ادب میں ملی نغموں پر بھی کافی وقیع مواد موجود ہے،اس تناظر میں آزاد کشمیر کی اردو شاعری میں ملی نغمہ نگاری کی روایت بھی تحقیق کا موضوع بن سکتا ہے۔

۴۔زیر نظر تحقیق آزاد کشمیر کی شاعری کے حوالے سے فکری رجحانات سے تعلق رکھتی ہے،جب کہ آزاد کشمیر کی شاعری کا اسلوبیاتی یا فنی حوالے سے بھی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

کتابیات

بنیادی ماخذ:

اسرار ایوب، برف سے حرف، لیاقت پبلی کیشنز، میرپور، ۱۹۹۵ء۔

افتخار مغل، ڈاکٹر، لہو لہو کشمیر، اجالا پبلی کیشنز، مظفر آباد، ۱۹۹۱ء۔

افتخار مغل، ڈاکٹر، انکشاف، اساطیر، لاہور، ۲۰۰۳ء۔

آمنہ بہار، ڈاکٹر، چناروں کی آگ، علی پرنٹر، راول پنڈی، ۱۹۸۹ء۔

رفیق بھٹی، ستون دار، پنچال پبلشرز، میرپور، آزاد کشمیر، جنوری ۱۹۹۴ء۔

رفیق بھٹی، پروفیسر، لہو نگر، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، جنوری ۱۹۹۷ء۔

صابر آفاقی، ڈاکٹر، سارے جہاں کا درد، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۰ء۔

صابر آفاقی، ڈاکٹر، شہر تمنا، ادبیات پبلی کیشنز، مظفر آباد، ۱۹۸۰ء۔

مشتاق شاد، نمبل، الحمد پبلشرز، میرپور، ۱۹۹۴ء۔

مشتاق شاد، ریگ ریگ، ماورا پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۲ء۔

نذیر انجم، پلک پلک زنجیر، کاشر پبلشرز، میرپور، ۱۹۹۲ء۔

نذیر انجم، فرازِ دار، مجلس فکر و ادب، میرپور، آزاد کشمیر، ۱۹۷۰ء۔

نذیر انجم، قرضِ سخن، ارشد بک سیلرز، میرپور، ۲۰۱۱ء۔

ثانوی ماخذ:

احمد عطاء اللہ، بھول جانا کسی کے بس میں نہیں، الرزاق پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۸ء۔

احمد فرازؔ، غزل بہانہ کروں، کاک پرنٹر، دہلی، ۲۰۰۲ء۔

اختر شیرانی، مقالات شیرانی، کتاب منزل، لاہور، ۱۹۴۸ء۔

اسلم راجا، کونپل کا بدن، ادارہ مصارف کشمیر، میرپور، ۱۹۹۷ء۔

اظہر راہی (مرتب)، کلیات نظیرؔ، رام نرائن لال بنی مادھو، الہٰ آباد، ۱۹۷۶ء۔

افتخار مغل، ڈاکٹر، آزاد کشمیر میں اردو شاعری، رُمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، راول پنڈی، ۲۰۲۰ء۔

اقبالؔ، علامہ، کلیات اقبال، الفیصل ناشران و تاجران کتب، لاہور، ۲۰۰۹ء۔
اکبرؔ الہٰ آبادی، کلیات اکبر الہٰ آبادی، بزم اکبر، کراچی، ۱۹۵۲ء۔
الطاف قریشی، شہر زندگی، نیلم پبلی کیشنز، مظفر آباد، ۱۹۹۵ء۔
انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء۔
ایاز عباسی، ظہور، خزینہ علم و ادب، لاہور، ۲۰۰۵ء۔
بشیر احمد مغل، شہر دربدراں، کاشر پبلشرز، میرپور، ۱۹۹۳ء۔
جاوید الحسن جاویدؔ، ابھی نظمیں ادھوری ہیں، رُمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، راول پنڈی، ۲۰۱۷ء۔
جعفر زٹلی، زٹلیات، نول کشور، لکھنو، ۱۹۴۱ء۔
جوشؔ ملیح آبادی، شعلہ و شبنم، مکتبہ جامعہ دہلی، نئی دہلی، ۱۹۳۶ء۔
حبیب جالبؔ، کلیات حبیب جالبؔ، طاہر سنز پبلشرز، لاہور، اپریل ۲۰۱۰ء۔
حبیب کیفوی، کشمیر میں اردو، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، ۱۹۷۹ء۔
حسرتؔ موہانی، دیوان حسرتؔ، مطبع الناظر، لکھنو، ۱۹۱۸ء۔
خلیق انجم، ڈاکٹر، مرزا محمد رفیع سوداؔ، انجمن ترقی اردو، علی گڑھ، ۱۹۶۶ء۔
رشید امجد، ڈاکٹر، پاکستانی ادب (رویے اور رجحانات)، پورب اکادمی، اسلام آباد، جنوری ۲۰۱۰ء۔
رشید امجد، ڈاکٹر (مرتب)، مزاحمتی ادب اردو، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۵ء۔
رفیع الدین ہاشمی، اصناف ادب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء۔
زکریا شاذ، خاموشی کی کھڑکی سے، زریون مطبوعات، فیصل آباد، ۲۰۱۳ء۔
سلیم اختر، ڈاکٹر، اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۹ء۔
سلیم اختر، ڈاکٹر، تنقیدی اصطلاحات (توضیحی لغت)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء۔
شفیق راجا، حرف حرف سمیٹوں، طلوع ادب پبلی کیشنز، باغ، ۲۰۰۳ء۔
شہباز گردیزی، اجلی مٹّی (انتخاب)، نکس پبلشرز، میرپور، ۲۰۱۵ء۔
شہباز گردیزی، خواب کون دیکھے گا، طلوع ادب پبلی کیشنز، باغ، ۲۰۰۸ء۔
صابر آفاقی، ڈاکٹر، نئے موسموں کی بشارت، دستاویز مطبوعات، لاہور، ۲۰۰۰ء۔
صفی مرتضیٰ، سید، اصناف ادب کا ارتقا، نسیم بک ڈپو، لکھنو، س ن۔

عابد محمود عابدؔ، اُداس ہنس لیں، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۲۱ء۔
عبد العلیم صدیقی، نہاں خانہ دل، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۲۰۱۰ء۔
فانیؔ بدایونی، کلیات فانی، ناز پبلشنگ، ہاؤس، دہلی، س ن۔
فتح محمد ملک (مرتب)، پاکستان میں اردو، جلد ۵، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۶ء۔
فتح محمد ملک، تحریک آزادیِ کشمیر (اردو ادب کے آئینے میں)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء۔
فرزانہ ناز، پروفیسر، کشمیر، اردو ادب اور طنز و مزاح، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف کشمیر سٹڈیز (نکس)، میرپور، اکتوبر ۲۰۱۶ء۔
فیض احمد فیضؔ، نسخہ ہائے وفا، مکتبہ کاروان، لاہور، س ن۔
محمد خان نشترؔ، لمحات نشتر، نیلم پبلی کیشنز، مظفر آباد، ۲۰۰۲ء۔
مخلص وجدانی، صلیبوں کا شہر، ادبیات، مظفر آباد، ۱۹۹۵ء۔
مرزا غالب، دیوان غالب، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۸ء۔
مسرت صبوحی، پروفیسر، کشمیر میں مزاحمتی ادب، علی پرنٹر، میرپور، ۲۰۱۴ء۔
میر تقی میرؔ، کلیاتِ میرؔ، نول کشور، لکھنو، ۱۹۴۱ء۔
ن۔م راشدؔ، کلیات راشد، کتابی دنیا، نئی دہلی، ۲۰۰۴ء۔
نثار ہمدانی، چنار، چاندنی اور چنبیلی، کشمیر سوسائٹی، مظفر آباد، س ن۔
نوازش علی، ڈاکٹر (مرتب)، پاکستان میں اردو ادب کے پچاس سال، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۷ء۔
واحد اعجاز میر، راستہ مت بدل، خزینہ علم و ادب، لاہور، ۲۰۰۴ء۔

مقالہ جات:

محمد آصف، اردو میں مزاحمتی شاعری کا تنقیدی مطالعہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اردو)، اسلامیہ یونی ورسٹی، بہاول پور، ۲۰۰۵ء
آصف اسحاق، آزاد کشمیر میں منتخب نظم گو شعرا کا فنی جائزہ، مقالہ برائے ایم فل اردو، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۱۹ء۔

رحمت علی خان، آزر عسکری: شخصیت و فن، مقالہ برائے ایم فل (اردو)، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۴ء۔
فرہاد احمد، آزاد کشمیر کے منتخب غزل گو شعرا، مقالہ برائے ایم فل (اردو)، نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، اگست ۲۰۱۷ء۔

لغات:

اردو لغت (تاریخی اصول پر)، جلد ہفت دہم، اردو لغت بورڈ، کراچی، دسمبر ۲۰۰۰ء۔
شان الحق حقی (مرتب)، فرہنگِ تلفظ، ادارہ فروغِ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء۔
عبد الحفیظ، ابو الفضل، مولانا، مصباح اللغات، مکتبہ برہان، نئی دہلی، ۱۹۹۰ء۔
مختصر اردو لغت، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۷ء۔
مولوی سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ، جلد چہارم، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، اگست ۱۹۷۷ء۔
مولوی فیروز الدین، الحاج، فیروز اللغات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۱۹۹۲ء۔
وارث سرہندی، شیخ، علمی اردو لغت (متوسط)، علمی کتاب خانہ، لاہور، س ن۔

رسائل و جرائد:

ادبیات، (سہ ماہی) اکادمی ادبیات، اسلام آباد، ۱۹۹۴ء۔
الماس، شمارہ تیئس، شعبہ اردو، شاہ عبد الطیف یونی ورسٹی خیر پور، سندھ، ۲۰۲۰ء۔
حسرت (علمی و ادبی مجلہ)، چراغ حسن حسرتؔ گورنمنٹ ڈگری کالج، کھوئی رٹہ، آزاد کشمیر، ۱۹۹۱ء۔
دو میل (علمی و ادبی مجلہ)، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج برائے طلبہ، مظفر آباد، آزاد جموں و کشمیر، ۲۰۱۴ء۔
رہبر (علمی و ادبی مجلہ)، آزاد کشمیر کالج ٹیچر ایسوسی ایشن (ایکٹا)، شمارہ ۱۳۔ ۲۰۱۲ء۔
روزنامہ صبح نو، مظفر آباد، ۲۷ جون ۲۰۲۲ء۔
سروش (علمی و ادبی مجلہ)، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج، میر پور، آزاد کشمیر، شمارہ ۲۰۱۱ء، شمارہ ۱۹۹۶ء، شمارہ ۱۷۔۲۰۱۶ء۔
سہ ماہی شوق، میر پور، آزاد کشمیر، مارچ ۱۹۹۵ء۔

سیماب (علمی وادبی مجلہ)، گورنمنٹ ڈگری کالج برائے طلبہ، افضل پور، میرپور آزاد کشمیر، ۲۰۱۵ء۔
نوید صبح (مجلہ)، علامہ اقبال گورنمنٹ ڈگری کالج، کوٹلی، آزاد کشمیر، ۱۹۸۶ء۔
ہفت روزہ کشمیر، مظفر آباد، مقبول بٹ نمبر، فروری ۱۹۹۴ء۔

ویب گاہیں:

www.deedbanmagazine.net